باب8

عدالت عالیہ میں خدمات

جوڈیشل سروس (ہائی کورٹ)

108

بحیثیت جج ہائی کورٹ 1991 تا 2001

آزاد جموں وکشمیر میں سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ کے ججوں کی تقرریاں آزاد کشمیر کے آئین کے تحت چیئرمین آزاد جموں وکشمیر کونسل جو وزیر اعظم پاکستان ہیں، کی منظوری سے ہوتی ہیں اوران کی تقرری کا باقاعدہ نوٹیفکیشن صدر آزاد کشمیر کی منظوری سے حکومت آزاد کشمیر کا محکمہ قانون جاری کرتا ہے۔ میری اور جسٹس ریاض اختر چوہدری صاحب کی بالترتیب بطور مستقل جج اور ایڈیشنل جج تقرری کی منظوری جموں وکشمیر کونسل نے اپنے مکتوب نمبر D.O. No. L-5/2/88 مورخہ 5 ستمبر 1990 کو دی تھی۔ اس مکتوب کے تحت سردار محمد اشرف خان صاحب جج ہائی کورٹ کی بطور جج سپریم کورٹ تقرری تھی۔ جسٹس ریاض اختر صاحب کی تقرری کی سفارش آئین کے تحت آزاد کشمیر کے دونوں چیف جسٹس صاحبان میں سے کسی نے بھی نہیں کی تھی۔ صدر آزاد کشمیر نے ان کی جسٹس ریٹائرڈ بشارت احمد شیخ صاحب کی عارضی طور خالی آسامی کے خلاف بطور ایڈیشنل جج کے خلاف آئین تقرری کی سفارش کی

134

تھی جبکہ میرے لیے دونوں چیف جسٹس صاحبان نے سفارش کی تھی۔

اس وقت پاکستان میں محترمہ بے نظیر بھٹو صاحبہ کی حکومت کے خاتمے کے بعد عبوری طور پر غلام مصطفی جتوئی صاحب بطور وزیر اعظم اور جنرل عبدالمجید ملک صاحب وزیر امورِ کشمیر تھے۔ آزاد کشمیر میں مرحوم ممتاز حسین راٹھور کی حکومت تھی جس پر میر پور سے تعلق رکھنے والے جاٹ برادران کا غلبہ تھا جبکہ مظفر آباد سے تعلق رکھنے والے وزرا کا تعلق پیپلز پارٹی سے تھا جو مجھے مسلم کانفرنس اور سردار قیوم صاحب کے ساتھ تعلق کی وجہ سے کسی طور قبول کرنے کو تیار نہیں تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں 1976ء میں وادی سری نگر سے یہاں آ کر آباد ہوا تھا جہاں پیپلز پارٹی سے تعلق رکھنے والے سینئر وکلا موجود تھے اور دوسرا یہ کہ میرا مسلم کانفرنس کی قیادت سے تعلق اور اس کی حکومت کا ایڈووکیٹ جنرل بھی رہا تھا، نیز الیکشن مہم میں ان کے لیے میری سرگرمیاں نمایاں رہی تھیں۔ میر پور کے جاٹ گروپ نے جسٹس ریاض اختر صاحب کے حق میں اور میرے مخالف اور مظفر آباد والوں کے میرے خلاف ہونے کی وجہ سے میرا تقرری کا نوٹیفکیشن جاری نہیں ہونے دیا جبکہ جسٹس ریاض اختر کا نوٹیفکیشن حکومت آزاد کشمیر نے جسٹس بشارت احمد شیخ جو اس وقت تک ہائی کورٹ کے جج تھے لیکن عارضی طور سپریم کورٹ میں ایڈہاک جج کی آسامی کے خلاف بطور ایڈیشنل جج مورخہ 23 جنوری 1991 کو جاری کیا۔ حالاں کہ آئین قانون اور روایات کے مسلمہ اصولوں کے تحت مستقل آسامیوں کے خلاف تقرری کے بعد ہی ایڈہاک یا ایڈیشنل ججوں کی تقرریاں ہوسکتی تھیں اور یہی اصول PLD 1998 SC 161 اور PLD 1997 SC 84 میں وضع کیا گیا ہے۔ مجھے مرحوم راٹھور صاحب نے اس سلسلہ میں مطلع فرما کر معذرت کر لی تھی کہ جب تک میری کابینہ اتفاق نہیں کرتی، میں آپ کی تقرری کا نوٹیفکیشن جاری نہیں کرسکتا یا آپ ان کو منائیں۔ میں نے ان لوگوں کے ساتھ کوئی رابطہ کرنے کی کوشش نہیں کی، حالاں کہ ان لوگوں کی طرف سے مجھے پیغام بھی ملتے رہے کہ میں اگر ان سے مل کر درخواست کروں تو میرا نوٹیفکیشن بھی جاری ہوجائے گا۔ لیکن میں نے معذرت کر لی۔

ادھر سردار عبدالقیوم خان اور عتیق خان کو اس بات سے شدید دھچکا لگا جب انہوں نے ریاض

اختر کو یہ کہتے سنا کہ سردار قیوم صاحب کا اس میں کیا احسان ہے؟ میں نے اپنی طاقت سے ایڈوائس اور نوٹیفکیشن جاری کروایا ہے۔ سردار صاحب کو یقیناً یہ گمان گزرا کہ ریاض اختر سودا بازی کر کے جاٹ گروپ اور پیپلز پارٹی کے ساتھ کسی سازش کے تحت شامل ہو گیا ہے۔ وہ ان دنوں خود بھی بہت ہی مایوس تھے اور ان کے ارد گرد کوتاہ اندیش اور خود غرض لوگوں کا گھیرا تھا جو سردار صاحب کی بات کے حق میں دلائل دے کر ان کو اور بھی طیش میں لاتے تھے جن میں سردار سیاب خالد، الطاف حسین کیانی اور میں بھی سردار صاحب کے بہت قریب تھا لیکن میرا ان پر اتنا اثر نہیں تھا کیوں کہ میں ان سے اختلاف کرنے کی وجہ سے پسند نہیں کیا جاتا تھا اور بالخصوص ان کے سیاسی جانشین عتیق احمد خان کو بالکل پسند نہیں تھا۔ اسی لیے عتیق احمد خان نے میرے بھائی نذیر احمد گیلانی کے وساطت سے مجھے ایک مرتبہ پیغام بھیجا جب مجاہد اوّل بات کر رہے ہوں تو گیلانی صاحب کو ان کی بات کے حق میں دلائل دینے چاہئیں۔ تردید، تنقید یا اختلاف نہیں کرنا چاہیے۔

سردار صاحب نے اپنے مصاحبین کی مشاورت پر جسٹس ریاض اختر کی تقرری کا نوٹیفکیشن صدارتی سیکرٹیریٹ کے ذریعہ مورخہ 31 جنوری 199 کو منسوخ کر دیا۔ اس کے علاوہ دو مزید لوگوں کے نوٹیفکیشن جن کی تقرری سراسر آئین، کے خلاف عام قانون کے تحت کروائی گئی تھی، جن میں جسٹس محمد صدیق فاروقی اور مرحوم سردار سجاول خان جو بطور ایڈیشنل جج ہائی کورٹ لگائے گئے تھے اور سلطان علی چوہدری جو مشیر رائے شماری مقرر ہوئے تھے، کے نوٹیفکیشن بھی اسی تاریخ کو الگ الگ نوٹیفکیشن کے ذریعہ منسوخ کیے گئے۔ اس کے علاوہ آزاد جموں وکشمیر کورٹس اینڈ لا زکوڈ کا آرڈیننس نمبر V جو مورخہ 31 جنوری 1991 کو جاری ہوا تھا جس کے تحت جسٹس محمد صدیق فاروقی اور سردار سجاول خان کی بطور ایڈیشنل جج تقرری کی بھی منسوخی کی گئی۔ حالاں کہ یہ صدر کے دائرہ اختیار میں نہیں تھا کیوں کہ آزاد کشمیر حکومت کی نسبت کوئی بھی نوٹیفکیشن چاہے اس کی منظوری صدر ہی کیوں نہ دیتے ہوں حکومت آزاد کشمیر کا متعلقہ سیکریٹریٹ یعنی محکمہ قانون ہی جاری کر سکتا ہے۔ اسی لیے اس پر عملدرآمد بھی نہیں ہوا۔ میں نے ساری معاملے میں اپنے تحفظات کا اظہار تو ضرور کر دیا تھا لیکن یہ ایک سیاسی معاملہ تھا جو دراصل

مسلم کانفرنس کی قیادت اور پیپلز پارٹی میں کشیدگی کی وجہ سے طول پکڑ رہا تھا[134]، ایسا ضرور ہونا تھا جو ہو کر رہ گیا۔ سردار عبدالقیوم صاحب پیپلز پارٹی کی حکومت کے خلاف ایک ایشو پیدا کرنا چاہتے تھے جو انہوں نے کر دیا، وگرنہ وہ اتنے بے خبر بھی نہیں تھے کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں غلط ہے۔ آزاد کشمیر کی پروقار عدلیہ میں اس کے بعد سے زوال شروع ہو گیا جو کہ آج تک تھمنے کو نہیں آیا۔

میں یہاں ایک مضحکہ خیز اور آزاد کشمیر کی polorised سوچ پر مبنی حقیقت کو بھی ریکارڈ پر رکھنا چاہتا ہوں۔ اس وقت کے سیکریٹری قانون جسٹس محمد صدیق فاروقی کی ایما پر آزاد کشمیر کورٹس اینڈ لا زکوڈ کی ترمیم کر کے اس کے تحت ہائی کورٹ میں ایڈیشنل ججز کی تقرری کی گنجائش پیدا کی گئی، حالاں کہ ججوں، ایڈیشنل ججز اور سپریم کورٹ میں ایڈہاک ججوں کی تقرری کا طریقہ کار آئین میں درج ہے اور صرف اسی کے تحت ہی ہو سکتا ہے۔ یہ آرڈیننس اس ارادہ سے جاری کیا گیا تھا کہ جسٹس محمد صدیق فاروقی کو بطور ایڈیشنل جج ہائی کورٹ مقرر کیا جائے۔ سردار قیوم صاحب کو اس گیم میں شامل کر کے ان کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لیے ان کے ایک رشتہ دار سردار سجاول خان (جو اس وقت سیشن جج تھے) کو بھی بطور ایڈیشنل جج ہائی کورٹ مقرر کیا گیا۔ یہ معاملہ صریحاً خلاف آئین اور روایات تھا لیکن اس کی منسوخی کے اقدامات اس سے بھی زیادہ قابل افسوس اور مضحکہ خیز عمل تھا۔ ہائی کورٹ کے ڈویژن بنچ نے اس کو خلاف آئین تو ضرور قرار دیا لیکن رٹ یہ کہہ کر جاری نہیں کی کہ ہائی کورٹ کے جج کے خلاف رٹ جاری نہیں ہو سکتی۔ عجیب منطق ہے کہ تقریاں تو غلط لیکن ان کو کالعدم قرار نہیں دینا۔ بعد ازاں سپریم کورٹ نے اپیل میں فیصلہ کیا کہ ایڈیشنل جج ہائی کورٹ کی تقرری صرف آئین کے تحت ہی ہو سکتی ہے اور وہ بھی چیف جسٹس صاحبان کی مشاورت اور آزاد کشمیر حکومت وکشمیر کونسل کی ایڈوائس پر۔ ان کی تقرری جسٹس غلام مصطفیٰ مغل، جو اس وقت ایڈووکیٹ تھے، نے چیلنج کیا تھا۔

سازشوں کا جال

جسٹس ریاض اختر وغیرہ کو گمان گزرا کہ شاید یہ سارا کچھ میں نے کرایا ہے حالاں کہ یہ سب

کچھ سردار قیوم صاحب' اوران کے فرزند عتیق احمد خان اوران کے دیگر صاحبان کے سیاسی معاملات پیدا کرنے کے اقدامات تھے جن کا میں عینی گواہ ہوں۔ ریاض اختر صاحب نے اس کا انتقام لینے کے لیے میر پور کے دو وکلاء چوہدری عبدالعزیز اور چوہدری محمد صدیق کے ذریعہ مورخہ 24 فروری 1991 کو میرے خلاف ان الزامات پر مبنی ہائی کورٹ میں درخواست دائر کروائی کہ میں مقبوضہ کشمیر سے آزاد کشمیر کی قانونی حکومت اور کشمیر کے کاز کو نقصان پہنچانے' تخریب کاری اور بحران پیدا کرنے کے لیے آیا ہوں اور وہاں سے جعلی لائسنس کی نقل بنا کر وہاں کی حکومت کو یہاں تسلیم کرانے آیا ہوں اس لیے میرا آزاد کشمیر میں جسٹس یوسف صراف صاحب کی ایماء پر جاری کردہ لائسنس بھی منسوخ کیا جائے۔ میرے خلاف مس کنڈٹ کی کارروائی کر کے لائسنس منسوخ کیا جائے اور جو عرصہ میں نے بطور ایڈووکیٹ جنرل کام کیا ہے وہ بھی غیر قانونی قرار دیا جائے۔ جب ان لوگوں سے اس وقت کے ہائی کورٹ کے جج چوہدری شیر زمان صاحب نے جو بعد ازاں چیف جسٹس ہائی کورٹ ریٹائرڈ ہوئے، نے ان کا بیان ریکارڈ کیا تو انہوں نے کہا کہ ان کے پاس اس سلسلے میں کوئی ثبوت نہیں ہیں، اس لیے وہ درخواست واپس لینا چاہتے ہیں۔ یہ درخواست انہوں نے واپس لے لی۔ میں نے ان لوگوں کی کبھی شکل تک نہیں دیکھی تھی اور نہ ہی میں آج تک ان کو پہچان سکتا ہوں۔ البتہ میرے چیف جسٹس ہائی کورٹ ہونے کے دوران ایک شخص چوہدری عبدالعزیز میرے پاس آیا اور معذرت کی اور برملا کہا کہ مجھ سے یہ غلطی کرائی گئی تھی جس پر معذرت خواہ ہوں۔ میں غیر متزلزل طور پر اس فرمان ایزدی پر یقین رکھتا ہوں۔

لمن صبر و غفر انک لمن عزم الامور

ترجمہ: جس نے صبر کیا اور معاف کیا، یہ عظیم کام ہیں۔

اس طرح ایک واقعہ مذکور ہے: مولانا شبلی نعمانی سے کسی نے پوچھا بڑا آدمی بننے کا آسان نسخہ کیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا، کسی بڑے آدمی پر کیچڑ اچھالنا شروع کر دو۔

یہ درخواست دلانے کا مقصد یہ تھا کہ میرا لائسنس وکالت منسوخ ہو جائے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ میرے حق میں جاری شدہ ایڈوائس بھی منسوخ ہو جائے گی اور میرے والی مستقل آسامی پر

ریاض اختر صاحب بطور مستقل جج تعینات ہو جائیں گے۔ لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

مظفر آباد میں مفاد پرستوں کا ایک ٹولہ تھا جو وکالت کے نام پر دکان داری کرتا تھا۔ اور کسی کو وکالت کے پیشے میں پہنچنے نہیں دیتا تھا۔ میرے، عبدالرشید عباسی، غلام مصطفی مغل، ابراہیم ضیا (جسٹسز) راجہ محمد حنیف خان کے وکالت میں جم جانے کے بعد ان کو مقابلہ کرنا پڑا۔ میں ان لوگوں کے ہوتے ہوئے ایڈووکیٹ جنرل اور پھر جج بن گیا اور وہ بھی ان کی مخالفت کے باوجود، وہ لوگ بات ہضم نہیں کر سکتے تھے، جنہوں نے سازشوں کا جال بنا کر مجھے پریشان کرنا شروع کر دیا۔ اور آج تک کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے جہاں میری مخالفت نہ کریں، لیکن میں نہ کبھی ان کے آگے جھکا اور نہ دب سکا۔ ہاں اللہ کی مہربانی یہ ہوئی کہ ان کی وجہ سے میں بہت سی قباحتوں اور غلط کاریوں سے بچا رہا جس وجہ سے اس نے عزت رکھی۔ یہ لوگ آج بھی سیاسی، سماجی، اخلاقی یا سرکاری ذمہ داری کو دکان داری کے طور پر دیکھتے ہیں اور ہر منصب اور عہدہ کو دکان داری کے طور پر استعمال کرتے ہیں اور اگر ان سے ہٹ کے کسی کو کوئی منصب مل جائے تو اس کی کردار کشی کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ خود کچھ کرنے کی ہمت نہیں رکھتے لیکن لوگوں کو اُکسا کر استعمال کرتے ہیں۔

میری اس سلسلے میں کوئی اطلاع تو نہیں لیکن اپنے جج ساتھیوں کے مزاج اور طریقہ کار کو جانتے ہوئے یہ گمان ہے کہ ایسا کرنے میں ان کی اعانت شامل رہتی رہے۔ اس گمان کی وجہ یہ ہے کہ چند ججز کی کئی قدریں مشترک تھیں مثلاً یہ کہ ان کا تعلق لبریشن لیگ کے نظریہ سے تھا اور مسلم کانفرنس کے بیک گراؤنڈ والے ہر شخص کے بارے میں یہ لوگ شرارت پر برسر پیکار رہتے تھے۔ ایک صاحب فری لانسر آدمی تھے، وہ کسی بھی وقت کسی کے کہنے یا اپنے کسی مقصد کے لیے کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ دوسرے صاحب بظاہر انتہائی مہذب' بھلی بات کہنے والے شریف النفس' ملنسار' خوش اخلاق اور مرنج مرنجاں طبیعت کے آدمی مشہور تھے لیکن جن سے ان کا ہمہ وقتی واسطہ پڑتا رہا ہے، کو اس بات کا تلخ تجربہ ہے کہ وہ اپنی بات پر کبھی قائم نہیں رہتے۔ ان کو دوستوں میں تفرقہ پیدا کر کے اپنے آپ کو نمایاں اور عزیز دکھانے کا ملکہ حاصل تھا۔ وہ درجنوں متحارب لوگوں کو بیک وقت خوش رکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور ہر ایک ان کے

بارے میں یہی خیال رکھتا ہے کہ یہ صرف میرے ہی ہم خیال اور خیر خواہ ہیں۔ وہ عدلیہ میں سارا عرصہ ججوں اور وکیلوں کو ایک دوسرے کے بارے میں بدگمان بنائے رکھنے کے باوجود خود سب کی نظروں میں معزز رہے۔ علاوہ ازیں ریاض اختر صاحب دعوتیں کھلانے، تحفے دینے اور خوش رکھنے کا فن جانتے تھے۔ ہائی کورٹ کے بہترین جج جسٹس شیر زمان چوہدری تھے جو کہ انتہائی شریف النفس انسان تھے اور اپنے کام سے کام رکھتے تھے۔ طبیعت کے بہت سخت تھے لیکن اچھی نیت کے مالک تھے۔ اس پس منظر میں معاملہ یہیں ختم نہیں ہوا بلکہ اس کے بعد میرے خلاف دو رٹ پٹیشنز اور ایک ریفرنس بھی دائر کرایا گیا۔

رٹ پٹیشنز

میرے جج بننے کے بعد پہلی رٹ پٹیشن مظفرآباد سے تعلق رکھنے والے ایک وکیل مرحوم سائیں مُلاں کے ذریعہ کرائی گئی جس کی وکالت مرحوم شیخ عبدالعزیز ایڈووکیٹ کر رہے تھے۔ ان دونوں کا تعلق لبریشن لیگ سے تھا۔ میری مصدقہ اطلاعات کے مطابق، جس کی بعد ازاں سائیں مُلاں ایڈووکیٹ نے تصدیق بھی کی اور میری دل آزاری پر معذرت کرتے ہوئے بتایا کہ ان کو جسٹس ریاض اختر نے ایسا کرنے پر آمادہ کیا اور ہائی کورٹ کے ججوں کی طرف سے ان کو مکمل تعاون کی یقین دہانی بھی کروائی گئی تھی۔ اس عرصہ کے دوران حکومت آزاد کشمیر بھی ریاض اختر کی ہم خیال ہو گئی تھی۔

رٹ میں جو بے بنیاد الزامات عائد کیے گئے تھے، ان میں سے چند یہ تھے کہ میری ہندوستانی ساری سندات اور مقبوضہ کشمیر کا لائسنس جعلی ہے۔ میری علی گڑھ یونیورسٹی کی ڈگری بھی جعلی ہے۔ میں نے حکومت کو دھوکہ دے کر آزاد کشمیر میں مستقل سکونت اختیار کی اور بدوں استحقاق مکان کی تعمیر کے لیے جگہ الاٹ کرائی' میرے حق میں آزاد کشمیر سے جاری ہونے والا وکالت کا لائسنس خلاف قانون ہے وغیرہ۔

چیف جسٹس ہائی کورٹ نے اس مقدمہ کی سماعت کے لیے فل بینچ تشکیل دیا لیکن خواجہ سعید

صاحب نے اس بینچ میں بیٹھنے سے معذرت کر لی چنانچہ چیف جسٹس عبدالمجید ملک[134] اور جسٹس شیر زمان چوہدری نے یہ رٹ باقاعدہ سماعت کے لیے منظور کر لی۔ ایک جج صاحب نے مجھے اس حکم کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل دائر کرنے کا مشورہ دیا اور ادھر اسی نے ہائی کورٹ کے ججوں کو اپیل دائر ہونے پر کہا کہ آپ کے خلاف گیلانی صاحب نے عدم اعتماد کا اظہار کر دیا ہے۔ میں نے جسٹس صاحب کا مشورہ صائب جانا اور سپریم کورٹ میں اپیل دائر کر دی۔ یہ پہلا مقدمہ تھا کہ ہائی کورٹ کے کسی ابتدائی درمیانہ حکم کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل دائر ہوئی ہو، وگرنہ ہمیشہ فائنل آڈر کے بعد ہی ایسا ہوتا ہے۔ یہی اعتراض حکومت وقت اور رسپانڈنٹ سائیں ملاں کی جانب سے اٹھایا گیا۔ اس اعتراض کو ہم نے اس دلیل سے مسترد کرا دیا کہ سپریم کورٹ رولز کے تحت اپیل فائنل حکم کے خلاف ہو سکتی ہے جبکہ آئین کی متعلقہ دفعہ کے تحت لیوٹو اپیل کے لیے فائنل حکم کی شرط نہیں ہے۔

اس کے بعد عدالت العالیہ کے ابتدائی یا درمیانی احکامات کے خلاف لیوٹو اپیل دائر ہونا ایک پریکٹس بن گئی جو ایک اچھی روایت نہیں ہے۔ لیکن جب ہائی کورٹ میں ججوں کی تعداد محدود اور سب کسی ایک مسئلہ پر ہم خیال اور کینہ پرور ہوں تو اس کا کوئی اور مداوا بھی ہونا چاہیے۔ سپریم کورٹ آزاد کشمیر کو براہ راست مقدمات کی سماعت کا اختیار بھی نہیں ہے جس طرح سپریم کورٹ پاکستان کو پاکستان کے آئین کی دفعہ (3)184 کے تحت ہے۔ سپریم کورٹ اس وقت جسٹس سردار سید محمد خان اور جسٹس بشارت احمد شیخ پر مشتمل تھی جن کی دیانت' امانت اور ذہانت پر کوئی بھی شخص انگلی نہیں اٹھا سکتا۔ انہوں نے لیوٹو اپیل منظور کرنے کے بعد عدالت عالیہ کے حکم کو کالعدم قرار دیا یہ فیصلہ سید منظور حسین گیلانی بنام سائیں ملاں ایڈووکیٹ کے عنوان کے تحت [PLJ 1993 SC AJ&K 55=PLD 1993 SC AJ&K 12] میں رپورٹ ہے۔ ان نامساعد حالات میں اکثر غالبؔ کا شعر گنگنا کر مُسکرا اٹھتا۔

غالبؔ برا نہ مان، جو واعظ برا کہے
ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

ہائی کورٹ کے انتظامی اختیارات حکومت سے واپس لینے پر ٹکراؤ

اس زمانے میں ہائی کورٹ اور اس کے ماتحت عدلیہ کا انتظامی اختیار حکومت کے پاس تھا۔ مجھے اس بات کا شدید دکھ تھا۔ میں اس کو عدلیہ کی آزادی اور خودمختاری پر ایک کاری ضرب سمجھتا تھا۔ عدلیہ کے بارے میں میرا تصور وہی تھا جو میں نے ہندوستان اور بالخصوص مقبوضہ کشمیر میں دیکھا تھا جہاں ہائی کورٹ کی مرضی کے بغیر کسی بھی عدالت کے احاطہ میں کوئی فوجی تو کیا کوئی سول انتظامی افسر بدون اجازت داخل بھی نہیں ہوسکتا تھا۔ حکومت اس کے کسی انتظامی معاملہ میں مداخلت کرے یا کوئی حکم جاری کرے یا کسی اور طور پر عمل دخل کرے اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اسی طرح ججوں کے معیار اور اختیار کے بارے میں بھی میرا تصور وہی تھا جو وہاں کے چھوٹے سے چھوٹے جج سے لے کر بڑے سے بڑے جج کا ہے جو تعلقات میں کم آمیز اور کم گفتار' لیکن اختیارات کے استعمال کرنے میں سخت گیر' محکم گیر' اور کسی دباؤ یا اثر کی لپیٹ میں نہیں آتے۔ میں نے یہی طرزِ عمل اپنایا۔ جن لوگوں کے ساتھ تعلقات تھے یا تو کم سے کم یا بالکل ختم کر دیئے۔ کسی معاملہ میں رائے دینی یا کسی فنکشن میں شرکت کرنا تقریباً ختم کر دیا۔ حکومت کے مقابلہ میں شہری کے حقوق کو ترجیح دی اور ریاست کے مفادات کو ہر ایک پر ترجیح میں نے اپنا نصب العین بنالیا۔

اس وقت سردار عبدالقیوم صاحب کی حکومت عملاً سردار عتیق احمد خان' سردار سیاب خالد وزیر قانون اور عبدالرشید عباسی سپیکر اسمبلی چلاتے تھے۔ ان کے من مانے احکامات اور اقدامات بالخصوص ملازمین کے حوالے سے روزمرہ عدالتوں میں مقدمات کے موضوع بنتے تھے جو ایک شرارت کے تحت ایک جج صاحب کے کہنے پر میرے پاس بھیج دیتے تھے اور کچھ کیس اپنے پاس رکھتے تھے جبکہ دیگر جج صاحبان روٹین کے غیر اہم اور بے ضرر مقدمات کی سماعت کرتے تھے۔ میرے اور ملک صاحب کے احکامات سے حکومت بہت نالاں تھی۔ چوں کہ حکومت کے خلاف اکثر مقدمات ہمارے پاس ہی ہوا کرتے تھے، اس لیے زیادہ احکامات بھی ہمارے ہی ہوا کرتے تھے۔ اس بات کو اس مخصوص مفاد پرست گروہ نے بہت ایکسپلائیٹ کیا اور حکومت کو میرے خلاف لا کھڑا کیا۔ ان میں سے چند ایک

واقعات کا ذکر کرنا میں ضروری سمجھتا ہوں تا کہ عدلیہ کی آزادی اور خودمختاری کے بارہ میں اور اعلیٰ عہدے داران کے طرزِ عمل اور ان کے مفادات کو زک پہنچنے کے ردِ عمل میں جو کچھ میرے ساتھ ہوا، اس کا قارئین صحیح ادراک کر سکیں کیوں کہ یہی کچھ ہر اس جج کے ساتھ ہوتا ہے یا ہوسکتا ہے جو ایسا طرزِ عمل اختیار کرے گا۔

مجھ سے عدلیہ کی انتظامیہ کے سامنے بے بسی دیکھی نہ گئی بالخصوص ماتحت عدلیہ میں تقرریوں' تبادلوں اور ترقیابیوں کی صورت میں محکمہ قانون جس ماتحت جج کو جس وقت اور جتنی بار چاہے مغرب سے مشرق تبادلہ کر سکتا تھا بلکہ اس وقت کے وزیر قانون نے ہمارے ایک سول جج کا چھے ماہ میں تین مرتبہ تبادلہ کیا اور اس کو کہا تھا کہ تمہارا بستر کندھے پر ہی رہے گا۔ نہ صرف یہ بلکہ جس شخص کو چاہتے' ہائی کورٹ کا رجسٹرار یا ڈپٹی رجسٹرار مقرر کر دیتے اور چیف جسٹس کو پتا بھی نہ ہوتا۔ ایسے حالات میں میں نے ایک روز ججز کا اجلاس بلانے کرنے کے لیے چیف جسٹس کو تحریک کی جس کے سامنے میں نے یہ سارا معاملہ رکھا۔ سب نے اس پر افسوس کا اظہار کر کے اتفاق کیا کہ یہ غلط ہے اور اس معاملہ کو کسی طرح روکنا چاہیے۔ میں نے آئین کی دفعہ 46 اور آزاد جموں وکشمیر کورٹس اینڈ لاز کوڈ کی دفعہ 35 کے تحت ایک قرارداد لکھ کر پیش کی۔ ہر دو دفعات کی منشا یہ ہے کہ ہائی کورٹ کو تمام ماتحت عدالتوں کا کنٹرول اور انتظام وانصرام کا اختیار حاصل ہوگا۔ اس ریزولوشن کے تحت ججز کونسل نے یہ قرار دیا کہ آئندہ کے لیے ماتحت عدلیہ اور عدالت عالیہ کے عملہ کی تقرریوں' تبادلوں اور ترقیابیوں کا اختیار صرف ہائی کورٹ استعمال کرے گی اور اگر حکومت کی طرف سے ایسا کوئی حکم جاری ہوا تو اس پر کوئی عمل درآمد نہیں ہوگا۔ اس پر سب لوگوں کے دستخط ہو گئے۔

میرا قلمی مسودہ قرارداد ریاض اختر صاحب نے اپنے پاس رکھ لیا جبکہ سب کا دستخطی ججز کمنٹس بک میں موجود ہے۔ قلمی مسودہ سردار قیوم صاحب' سیاب خالد وزیر قانون اور سردار عتیق احمد خان کو دکھا کر ان کو میرے خلاف مشتعل کیا کہ وہ آپ کے اختیارات سلب کروانا چاہتا ہے جبکہ اس نے اپنا کہا کہ اس نے اس سے اتفاق نہیں کیا۔ سردار صاحب نے میرے بھائی نذیر گیلانی کے ذریعہ مجھے پیغام بھیجا کہ میں

ایسا کیوں کرتا ہوں جبکہ باقی لوگوں کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ میں نے اس کو اصل صورت حال بتائی لیکن نالائق لوگ ہمیشہ سازش، چغلی اور غلط بیانی سے دوسرے کو اتنا مسحور کر دیتے ہیں کہ وہ کسی کی بات سننے کو تیار ہی نہیں ہوتے۔ چنانچہ ان لوگوں نے میرے خلاف ایک محاذ کو مکمل طور گرم کر دیا۔ بہرحال ماتحت عدلیہ کے انتظامی معاملات کے بارے میں حکومت کی مداخلت بند ہوگئی اور ادارے اور ماتحت عدلیہ کی کارکردگی میں استحکام پیدا ہونے کے علاوہ عدلیہ کے وقار میں بحیثیت ایک ادارہ اضافہ ہوا۔

اسی عرصہ کے دوران وزیر قانون سردار سیاب خالد اور سیکریٹری قانون جسٹس ریٹائرڈ محمد صدیق فاروقی نے حکومت سے ایک نوٹیفکیشن جاری کروایا کہ راولاکوٹ کے مقام پر ان کے نام الاٹ شدہ جو زمین آزاد کشمیر یونیورسٹی کے قبضہ میں ہے، یونیورسٹی اس کو اپنے مقاصد کے لیے حاصل کر کے اس کا معاوضہ مالکان کو دے۔ یہ نوٹیفکیشن ہائی کورٹ میں چیلنج ہوا۔ یونیورسٹی کا موقف تھا کہ ان لوگوں کی موقع پر کوئی زمین ہی نہیں ہے اور جس کو یہ لوگ اپنی زمین ظاہر کر رہے ہیں وہ ایک پہاڑ ہے جو یونیورسٹی کے کسی کام کا نہیں ہے۔ میں نے الاٹیوں کے موقف سے اتفاق نہ کرتے ہوئے ان کے خلاف فیصلہ دیا کہ جب یونیورسٹی کا واضح موقف ہے کہ زمین موقع پر ہے ہی نہیں اور اگر کوئی ہے بھی تو وہ یونیورسٹی کو مطلوب نہیں ہے تو اس کا یونیورسٹی کے مقاصد کے لیے حصول یا معاوضہ بلاجواز ہے۔ میں نے ریمارکس دیتے ہوئے لکھا کہ ''قومی خزانہ ریوڑیاں نہیں ہیں کہ خیرات کے طور پر صاحب اثر لوگوں میں تقسیم کی جائیں۔''

ایک اور کیس جو میرے زیر سماعت آیا، ایک ٹھیکیدار کا تھا جس کا موقف تھا کہ میر پور کے علاقہ میں غالباً کسی سڑک یا پل کی تعمیر کے لیے مدمقابل کے مقابلہ میں اس نے 20% کم پیشکش کی تھی جبکہ کام زیادہ لاگت والے ٹھیکیدار کو اس لیے دیا گیا کہ وہ اس وقت کے وزیر تعمیرات عامہ چوہدری محمد یوسف (جو حکومت کے سینئر وزیر بھی تھے) کے ایک عزیز کو دیا گیا۔ میں نے یہ ٹھیکہ کم بولی والے کے حق میں الاٹ کرنے کا حکم دیا اور وزیر کے متعلق ریمارکس دیئے کہ ''اس قوم کی حالت قابل رحم ہے جس کی قیادت بددیانتی پر اتر آئے۔'' ان ریمارکس کے خلاف اس وزیر نے سپریم کورٹ میں اپیل کر کے ان کو حذف کرایا۔ اس کے علاوہ اور بہت سارے مقدمات میں حکومت کے وزیروں اور بیوروکریٹس کے

ذاتی مفادات کو جب زک پہنچنی شروع ہوگئی اور ان کی ایک چال بھی مجھ پر نہ چل سکی[134] تو میرے ایک دو ساتھیوں کے ساتھ مل کر میرے خلاف برطرفی کے لیے سپریم جوڈیشل کونسل میں ریفرنس دائر کرنے کے لیے کارروائی شروع ہوگئی، اس میں اس وقت کے وزیر قانون اور میرے ایک ساتھی جج ریاض اختر اور سیکریٹری قانون پیش پیش تھے۔

سپریم جوڈیشل کونسل میں ریفرنس

میری مصدقہ اطلاعات کے مطابق اس وقت کے صدر سردار سکندر حیات خان کی ان کو حمایت حاصل تھی اور ایسا کرنے سے پہلے سردار سیاب خالد نے صدر سے معاملہ گفت وشنید کے ذریعے سے یقین دہانی حاصل کر لی تھی کہ وہ ریفرنس سپریم جوڈیشل کونسل کو بھیج دیں گے۔ اس بات کی تصدیق بعدازاں سیاب خالد نے خود میری موجودگی میں اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کی کہ اس کو صدر صاحب نے ایسا کرنے کے لیے کہا تھا۔ بہرحال یہ حقیقت ہے کہ صدر صاحب کو انہوں نے اعتماد میں لے کر ایسا کیا تھا۔ صدر صاحب نے اپنے ایما پر ایسا نہیں کرایا تھا۔ صدر صاحب اس وقت حکومت سے نالاں تھے اور ان کی خواہش تھی کہ حکومت اور عدلیہ کی آپس میں ٹکر لگے جس وجہ سے میرے خیال میں انہوں نے ایسا کرنے پر اتفاق کیا اور انہوں نے بعد میں اس معاملہ کو خوب ایکسپلائٹ کیا اور حکومت کو آڑے ہاتھوں لیا جس سے میرے اس گمان کی تصدیق ہوتی ہے کہ صدر صاحب نے اپنے سیاسی نمبر سکور کرنے اور حکومت کی سبکی کے لیے ایسا کرایا تھا۔

سردار عبدالقیوم صاحب وزیر اعظم کے بیرون ملک دورہ امریکہ کے دوران، اس وقت کے قائم مقام وزیر اعظم چوہدری محمد یوسف کی سفارش پر صدر سے منظوری حاصل کر کے ستمبر 1993ء میں میرے خلاف سپریم جوڈیشل کونسل میں بے سروپا الزامات پر مبنی ایک ریفرنس دائر کیا گیا۔ اس میں زیادہ تر الزامات مختلف مقدمات میں میرے فیصلوں کی ناگواری کی وجہ سے خلافِ قانون ہونے، حکومت سے ناجائز مراعات طلب کرنے، تاریخ پیدائش صحیح درج نہ کرنے، بحیثیت ایڈووکیٹ جنرل کسی شخص سے 1000 روپے رشوت لینے، ناجائز طور مکان کے لیے ایک کنال متروکہ رقبہ الاٹ کرانے

اور حکومت سے مکان بنانے کے لیے ہاؤس بلڈنگ ایڈوانس حاصل کرنے کے باوجود مکان نہ بنانے وغیرہ پر مبنی تھی۔ یہی الزامات اس سے پہلے رٹ پٹیشن میں بھی لگائے گئے تھے۔ یہ الزامات پڑھنے سے واضح ہوتا ہے کہ یہ محض مجھے دبانے اور استعفیٰ دینے پر مجبور کرنے بصورتِ دیگر حکومت کے ساتھ مفاہمت کرنے کے لیے کیا گیا تھا۔ دوسروں پر جھوٹے الزام لگانے والے دراصل احساسِ کمتری کے مارے ہوتے ہیں اور کسی کی صلاحیتوں سے خائف ہو کر ایسے طریقوں سے اپنی متکبرانہ نفسیات کو غذا فراہم کرتے ہیں۔

میرے خیال میں ایک آدھ کے سوا میرے ساتھی بھی اس سازش میں شامل تھے۔ حکومت مخالف تھی اور پروپیگنڈا بہت ہی غلیظ تھا یہاں تک کہ میرے مرزائی اور ہندوستانی جاسوس ہونے کا شوشہ عام کیا گیا۔ جن لوگوں کے ساتھ میرا تعلق تھا یعنی مسلم کانفرنس والے، وہی میرے خلاف صف آراء تھے اور جو لوگ ان کے ساتھ وابستگی کی وجہ سے میرے خلاف تھے، ان سے خیر کی توقع نہ تھی۔ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ جب مشکل آئے تو صبر اور نماز سے مدد لیں۔ میں نے ایک رات بعد از نماز عشاء اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر دعا مانگی کہ یا اللہ میری مدد فرما کہ میں اس مصیبت کا کس طرح مقابلہ کروں۔ میرے ذہن میں اچانک ایک خیال پیدا ہوا کہ قرآن پاک سے فال کے ذریعہ رہنمائی حاصل کروں، چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔ مجھے قرآن پاک سے جو آیت کریمہ رہنمائی کے لیے ملی وہ سورہ مبارکہ ''آل عمران'' کی آیت نمبر ''200'' ہے جو کہ درج ذیل ہے:

''یا ایھاالذین آمنو الصبرو وصابرو و رابطو واتقواللّٰہ لعلکم تفلھونo''

اس سے میرے حوصلے مزید بلند ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ سے ہدایت چاہنے والوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی ہدایت ہمیشہ ہی میسر ہوتی ہے، صرف صدقِ دل سے دعا مانگنے کی دیر ہوتی ہے۔ میری زندگی کا تجربہ ہے بزرگوں کی دعا اور اللہ کے کلام کی تاثیر ضرور ہوتی ہے۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ مجھے ان سب کا مقابلہ کرنا ہے۔ اسی دوران میں نے چیف جسٹس کو لکھ کر بھیج دیا کہ چوں کہ میرے خلاف ریفرنس دائر

کیا گیا ہے، اس لیے میرے پاس مقدمات سماعت کے لیے نہ بھیجے جائیں۔[134] لیکن چیف جسٹس نے اس سے اتفاق نہیں کیا۔ مقدمات سماعت کے لیے بدستور بھیجتے رہے۔ ادھر سپریم جوڈیشل کونسل نے ریفرنس پر کوئی کارروائی نہیں کی۔ شاید کونسل ان الزامات سے مطمئن بھی نہیں تھی، اس لیے اس پر کافی عرصہ تک کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔ سپریم کورٹ میں اس وقت سردار سید محمد مرحوم چیف جسٹس اور بشارت احمد شیخ جج تھے جو شریف النفس اور حکومت کی سازش کا حصہ نہیں تھے۔ سید محمد صاحب انتہائی کم آمیز اور بشارت صاحب مجلسی آدمی تھے لیکن ان پر کوئی اثر انداز نہیں ہو سکتا تھا۔

ادھر آزاد کشمیر بھر کی وکلا تنظیموں، ملازمین کی تنظیموں، سیاسی جماعتوں، طلبا کی تنظیموں اور صحافیوں نے حکومت کے اس عمل کے خلاف شدید ردِعمل کا اظہار کیا۔ ہڑتالیں، جلسے جلوسوں بلکہ لاٹھی چارج تک کی نوبت آئی۔ ہر روز مذمتی قراردادوں اور بیانات سے اخبارات بھرے پڑے رہتے تھے اور حکومت کے لیے لاء اینڈ آرڈر کا مسئلہ بن گیا تھا۔ ممکن ہے یہ میری کارکردگی پر اطمینان کا اظہار بھی ہوتا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ مجھے نشانہ بنا کر عدلیہ پر جو وار کیا گیا تھا، اس کو رائے عامہ نے قبول نہیں کیا اور آزاد کشمیر کے علاوہ پاکستان بھر کی دیگر بار ایسوسی ایشنز اور رائے عامہ نے اس کے خلاف شدید ردِعمل ظاہر کیا۔ معتبر اخباروں اور کالم نویسوں نے حکومت کی درگت بنا دی۔ صورت حال سے نمٹنے کے لیے سردار قیوم صاحب نے امریکہ کا دورہ مختصر کر کے اپنے رفقا اور بار ایسوسی ایشنز کے نمائندوں سے ملاقات کے بعد ریفرنس کو واپس کرنے کی سفارش کی البتہ اس میں ایک شرارت کے طور لکھا کہ ''سردست واپس کیے جانے کی سفارش کی جاتی ہے۔'' اس پر صدر سکندر حیات نے حکومت کو پھر لتاڑا اور ان کی بھرپور سبکی کرائی جس کے ساتھ ہی اپنے ایک مکتوب کے ذریعے سپریم جوڈیشل کونسل کو کارروائی ختم کرنے کی سفارش کی جس نے مطابقاً ساری کارروائی داخل دفتر کر دی۔ اس سارے عرصہ کے دوران مجھ پر سردار قیوم صاحب کو ملنے کے لیے بہت دباؤ ڈالا گیا لیکن میں نے ان سے ملنے یا بات کرنے سے انکار کر دیا۔ سردار قیوم صاحب اور عتیق خان کے ساتھ ملنے کے لیے جسٹس غلام مصطفیٰ مغل، راجہ فاروق نیاز سیکریٹری، اور کئی لوگوں نے مجھے آمادہ کرنے کی کوشش کی لیکن میں نے اتفاق نہیں کیا۔

ریفرنس عوامی دباؤ پر واپس لیا گیا جو نہ صرف آزاد کشمیر کے لوگوں کی طرف سے تھا بلکہ پاکستان کی بار ایسوسی ایشنز اور عوامی ردِعمل بھی اس میں شامل تھا۔ جسٹس غلام مصطفیٰ مغل، جسٹس چوہدری ابراہیم ضیا، جسٹس راجہ صداقت حسین، کے ڈی خان، اے ڈی خان، ممتاز نقوی، ادریس مغل، مرزا نثار اور چوہدری محمد یوسف (کوٹلی سے) اس سلسلہ میں نمایاں تھے۔ راجہ صداقت حسین جو اب ہائی کورٹ کے جج ہیں نے مظفر آباد ضلعی انتظامیہ کو مقفل کر کے مفلوج کر دیا تھا۔ آزاد کشمیر کے وکلا بلا امتیاز جماعت اس پر صف آراء تھے۔

اس عرصہ کے دوران کا افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ میرے چند ایک ساتھیوں جن کی حکومت کے ساتھ ساز باز تھی نے، میرے خلاف یہ پروپیگنڈا کیے رکھا کہ حکومت نے میرے ہندوستان کے ساتھ ساز باز ہونے اور ہندوستان کا جاسوس ہونے کے الزام کی بنا پر میرے خلاف ریفرنس دائر کیا ہے۔ سیاب خالد نے تو یہاں تک کہا کہ میرا دہلی کے ایک بینک میں اکاؤنٹ ہے جس میں باضابطہ حکومت ہندوستان رقم جمع کراتی ہے اور میں جب حج یا عمرہ پر جاتا ہوں تو حکومت ہند کے اعلیٰ عہدیداران کے ساتھ میری جدہ اور مکہ شریف میں میٹنگ ہوتی ہے۔ یہ خطرناک پروپیگنڈا تھا جس پر نہ صرف باقی لوگوں، بلکہ میرے بھائی نذیر گیلانی بھی کان دھرنے پر مجبور ہو گئے اور ایک دن مجھ سے پوچھا بھی کہ کیا دہلی میں آپ کا کوئی بینک اکاؤنٹ ہے؟

میرے نزدیک دنیا کے قبیح گناہوں میں سے وطن دشمنی کا گناہ ہے، اسی لیے بین الاقوامی قانون کے تحت جاسوس کی سزا موت ہے اور یہ بالکل صحیح ہے۔ اگر اس قسم کے غلط الزامات لگانے والے کی بھی یہی سزا مقرر کی جائے تو بہت ہی اچھا ہوگا اور اگر ایسا ہو جائے تو آزاد کشمیر کے ہی نہیں بلکہ پاکستان کے کئی صف اوّل کے لیڈر پھانسی کے مرتکب قرار پائے جائیں گے۔ میرا ایمان ہے کہ دنیا میں شعور رکھنے والا کوئی بھی غیرت مند ایسا نہیں ہوگا جو اپنے وطن کے خلاف دشمن سے ساز باز رکھتا ہو، اگر ایسا ہو تو وہ کوئی بے غیرت، ہوس، حرص اور لالچ کا مارا ہوگا، جو انسان نہیں بلکہ حیوان صفت وحشی ہے۔

یہ معاملہ میرے لیے بہت سنگین تھا۔ میں نے اس وقت مظفر آباد میں موجود ملٹری انٹیلی

جینس کے کرنل انچارج جن کا کوڈ نام جاوید اور اصل نام میرے خیال میں الطاف تھا، کو اپنے گھر بلا کر یہ معاملہ بتایا اور پوچھا کہ اگر کوئی ایسی بات ہے تو مجھے بتائیں، ممکن ہے میرے خلاف کوئی من گھڑت ریکارڈ مرتب کیا گیا ہو۔ موصوف نے بڑے واضح الفاظ میں بتایا کہ یہ سارا سیاسی پروپیگنڈا ہے۔ مجھے انہوں نے اپنے جنرل علی قلی خان سے مظفر آباد بریگیڈ میں ملایا جہاں وہ دورے پر آئے تھے۔ انہوں نے سردار صاحب کے نام دو تین صلواتیں کہتے ہوئے کہا کہ یہ ان کی بلیک میلنگ ہے۔ غالباً انہوں نے خود یا کسی اور کے ذریعہ جب سردار صاحب تک یہ بات پہنچائی تو وہ بھانپ گئے کہ ان کی یہ بات نہیں چل سکے گی تو وہ اس سے بالکل ہی منکر ہو گئے۔ میں نے اپنے پائے استقلال میں ذرا بھی لغزش نہ آنے دی بلکہ پہلے سے زیادہ مستعدی اور استقامت سے کام کرتا رہا۔ سردار صاحب کی حکومت کی ساکھ، عتیق خان کی حکومت کے کاموں میں بے سرو پا مداخلت اور بلاوجہ چوکھی لڑائی لڑنے کی وجہ سے بہت متاثر بے وقار اور بے توقیر ہو گئی تھی۔ ادھر مرکز میں میاں نواز شریف صاحب کی حکومت بھی بدل گئی اور آزاد کشمیر میں الیکشن بھی قریب آ گئے تھے جس کی وجہ سے ان کے اختیارات غیر مرئی ہاتھوں میں چلے گئے اور سردار صاحب صرف دستخط کرنے کی حد تک ہی رہ گئے تھے۔

میرے خلاف سازشوں کا جال بدستور بچھا رہا اور اتنے مقدمات، درخواستوں اور ریفرنس کی پے در پے ناکامیوں کے باوجود بھی بداندیشوں نے میرا پیچھا نہ چھوڑا۔ اس کے بعد میر پور سے تعلق رکھنے والے ایک ریٹائرڈ سیشن جج و سیکریٹری قانون راجہ بشیر احمد خان نے میرے خلاف ایک اور رٹ دائر کر دی اور اس میں تقریباً وہی سارے گراؤنڈ لیے گئے جو اس سے پہلے کی رٹ درخواستوں اور ریفرنس میں فیصلہ ہو چکے تھے۔ یہ رٹ خواجہ محمد سعید صاحب نے ابتدائی سماعت کے بعد ہی خارج کر دی جس کے خلاف اپیل بھی سپریم کورٹ نے خارج کی۔ راجہ صاحب نے بعد ازاں مجھ سے معذرت بھی کی اور ہمیشہ شرمندگی ہی محسوس کرتے رہے۔

میں نے ان تمام تر بداعمالیوں کے باوجود ان سب لوگوں میں سے کسی کے خلاف بغض یا عناد نہیں رکھا اور ایسا طرزِ عمل اختیار کیا جیسا کہ کچھ ہوا ہی نہیں اور ہونا بھی ایسا ہی چاہیے۔ بدخواہوں اور

بدنیتوں کو اپنے اچھے طرزِ عمل سے شکست دینا چاہیے نہ کہ انتقام کی آگ اپنے دل میں جلائے رکھ کر اپنے لیے بھی روگ پیدا کریں اور خدا تعالیٰ کی ناراضی بھی مول لیں۔ بہترین انتقام معاف کرنا، صبر اور استقامت رکھنا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ اس کی توفیق دے تو اس سے اعلیٰ کام اور کوئی نہیں ہے۔

"انک لمن عزم الامورo"

ان سب سرگرمیوں کے پس پردہ ریاض اختر صاحب کا کلیدی کردار تھا جن کو ہمارے ایک ساتھی اکساتے تھے کیوں کہ انہوں نے مجھے عدلیہ سے نکالنے کے لیے کوئی بھی حربہ استعمال کیے بغیر نہیں چھوڑا۔ انہوں نے یکے بعد دیگرے کشمیر کونسل کے چیئرمین کے پاس دو مرتبہ عرضداشتیں پیش کیں کہ وہ چوں کہ ہائی کورٹ کے ایڈیشنل جج کے طور مجھ سے پہلے تعینات ہوئے جن کو غلط طور نکالا گیا اس لیے وہ مجھ سے اور ان کے بعد لگنے والے دو ججوں محمد صدیق فاروقی اور چوہدری محمد تاج سے سینئر ہیں۔ ایک عرضداشت میاں محمد نواز شریف کو ان کی جماعت کا ہم نوا بن کر لکھی کہ ان کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے اور دوسری جنرل مشرف کو جب وہ پاکستان کے چیف ایگزیکٹو کی حیثیت سے آزاد کشمیر کونسل کے چیئرمین تھے۔ اس میں اپنے آپ کو سیاست گزیدہ ظاہر کر کے اپنی سنیارٹی چاہی۔ حالاں کہ ان کی تقرری کی سفارش اور اس کا نوٹیفکیشن بالکل واضح تھا کہ ان کی تقرری عارضی طور پر جسٹس بشارت احمد شیخ صاحب کے سپریم کورٹ میں ایڈہاک جج کے طور تقرری کی مدت تک کے لیے تھی اور جب وہ مدت ختم ہوگئی تو ان کی تقرری بھی خود بخود ختم ہوگئی۔

انہوں نے ایڈیشنل جج شپ سے فارغ ہو کر دوبارہ وکالت شروع کر دی اور اس کے بعد سردار قیوم صاحب کی حکومت نے ان کی خاطر پہلے لاء کمیشن کا قانون بنایا تا کہ ان کو اس کا چیئرمین بنایا جائے لیکن بعد ازاں شریعت کورٹ ایکٹ میں خصوصی ترمیم کر کے ان کی تقرری کی گنجائش پیدا کی اور انہیں شریعت کورٹ آزاد کشمیر کا جج مقرر کیا۔ ان کو 1997 میں ہائی کورٹ کا مستقل جج تعینات کیا گیا۔ اس کے بعد انہوں نے یہ دعویٰ کیا کہ وہ باقی ججز سے سینئر ہیں۔ نہ معلوم ایسا انہوں نے سوچا بھی کیسے؟ دونوں مرتبہ ان کی عرضداشت مسترد ہوئی جبکہ دوسری مرتبہ بیوروکریسی نے اس پر خصوصی ریمارکس بھی

لکھے کہ کیا ایسا آدمی عدلیہ میں رہنے کے قابل ہے بھی؟ شریعت کورٹ کا قیام[134] ریاض اختر کی وجہ سے عمل میں لایا گیا جس میں نہ تو تقرری کے معیار کی اہلیت اور نہ ہی معیار رکھا گیا جو کشمیر لبریشن سیل کی طرح اعلیٰ سطح پر حکومت وقت کے لیے اپنے چہیتوں کو نوازنے کا ذریعہ بن گیا۔ جسٹس صدیق فاروقی صاحب اس کو شرارت کورٹ کہتے تھے۔

ریاض صاحب سنیارٹی میں اس وجہ سے بھی دعویٰ کرتے تھے کہ وہ جلد سے جلد اور مجھ سے پہلے چیف جسٹس بنیں۔ ایک دفعہ ہمارے ایک ساتھی چوہدری محمد تاج صاحب نے ان کو کہا کہ آپ کا بیٹا فوج کے لیے منتخب ہوا ہے۔ اس کو تاریخ پیدائش سے سنیارٹی دلانا تا کہ جلد از جلد چیف آف آرمی سٹاف بن کر مارشل لاء لگائے اور آپ کی سنیارٹی کا معاملہ آپ کے حق میں حل کرے۔ ہاہاہا۔

ریاض اختر صاحب کو یہ عرضداشتیں کچھ ساتھی جج لکھ کر دیتے تھے جو ان کی طرزِ تحریر اور الفاظ سے واضح ہے۔ ان کی تقرری بطور مستقل جج ہائی کورٹ 23 اکتوبر 1997 کو ہوئی۔ ان کی تقرری کی نسبت ایڈوائس کافی عرصہ تک سردار محمد ابراہیم خان صاحب صدر ریاست نے روکے رکھی اور بالآخر تقرری کی منظوری دی۔ سردار ابراہیم صاحب کا موقف یہ تھا کہ یہ ہائی کورٹ کا جج بننے کے اہل نہیں ہے۔ انہوں نے ایک مرتبہ سردار قیوم صاحب کو کہا تھا کہ "قیوم خان ایسے آدمی کو جج بنانا چاہیے جن کے سامنے ہم پیش ہونا اپنے لیے عزت کا باعث سمجھیں نہ کہ ایسا کہ جو ہمیں دیکھ کر ہی باتھ روم میں چلا جائے۔" ریاض اختر صاحب کی ایڈوائس روکنے کی وجہ سے پورے سدھن قبیلے کے خلاف پورا عرصہ ان کی مخاصمت رہی جس کا نزلہ انہوں نے جسٹس سردار محمد نواز خان پر گرایا اور ان کو چیف جسٹس ہائی کورٹ کے طور پر مستقل نہیں ہونے دیا۔

نئی قانونی روایات اور مقدمات

بحیثیت جج ہائی کورٹ میں نے چند ایسی قانونی روایات کی بنیاد ڈالی جس سے انتظامیہ اور لوگوں کے لیے بے انتہا آسانیاں پیدا ہوگئیں۔ رٹ پٹیشنز میں بالعموم میں نے ابتدائی سماعت سے

پہلے متعلقہ حکومتی ایجنسی سے اس پر تبصرہ مانگنا شروع کیا جس کا فائدہ یہ ہوا کہ عدالتی نوٹس ملتے ہی یا تو غلط معاملہ کو ایجنسی خود بخود ٹھیک کر دیتی تھی یا عدالت میں آ کر تبصرہ دے کر متنازع امور کو سامنے لایا جاتا تھا۔ اگر تو کوئی ممکنہ ریلیف کے تحت قانونی گنجائش ہوتی تو رٹ سماعت کے لیے منظور کی جاتی تھی، وگرنہ اسی مرحلے پر خارج ہو جاتی تھی یا فریقین کے درمیان مصالحت کی کوئی راہ نکل آتی تھی۔ اس طرح معاملات بغیر طوالت اور زر کثیر کے اخراجات کے حل ہو جاتے تھے۔ سماعت کے لیے صرف اسی معاملہ کو منظور کیا جاتا تھا جس میں 51 فیصد سے زیادہ کامیابی کے امکانات ہوتے۔ اس وجہ سے وکیل اور انتظامی محکمے بہت مطمئن اور خوش تھے۔ سب لوگوں کی کوشش ہوا کرتی تھی کہ ان کے مقدمات کی سماعت میری عدالت میں ہو۔

سروس کے معاملات، بنیادی حقوق کی نسبت رٹ پٹیشنز، حبس بے جا کی درخواستیں بالخصوص ملٹری انٹیلی جینس اور آئی ایس آئی کے خلاف درخواستیں، حکمران اور سیاست دانوں کے خلاف کیسز اور حکومت پاکستان کے خلاف کیسز تو صرف میرا ہی مقدر ہو گئے تھے اس وجہ سے ان لوگوں کے ساتھ ہر وقت میری ٹکراؤ کی پوزیشن رہتی رہی۔ تاہم یہ لوگ میرے ساتھ بھرپور تعاون کرتے تھے۔ ان کو اس بات کا یقین تھا کہ میں نے وہی کچھ کرنا ہے جو قانون اور واقعات کے مطابق میری دانست میں درست ہوگا اور کسی طور کسی بھی فریق کے دباؤ میں نہیں آنا اور نہ کسی سازش کا حصہ بننا ہے۔ بحیثیت چیف جسٹس میں نے گرمائی تعطیلات کے دوران ویکشن جج کے ساتھ Judge in waiting کا رواج ڈالا جس نے کام میں سرعت پیدا کی۔ وکلاء پر پابندی لگائی کہ Pleading اور Drafting انگریزی زبان میں ہونی چاہیے اور یہی ماتحت عدلیہ کو بھی کہا گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ قانون سب انگریزی زبان میں ہوتے ہیں جن کے اطلاق کا اظہار انگریزی ہی میں بہتر طور پر ہوسکتا ہے۔ عدالت میں بحث و مباحثہ بھی انگریزی میں شروع کرائی اس سے وکلاء اور ججوں کی کارکردگی پر مثبت نتائج مرتب ہوئے۔ وکلاء کے لیے وردی کا استعمال ضروری قرار دیا اور ماتحت عدلیہ کو حکم دیا کہ بغیر وردی کسی وکیل کو پیش ہونے کا موقع نہ دیں۔

دو سنسنی خیز مقدمات

جورا آئی ایس آئی کیس:

ہائی کورٹ میں بطور جج میں پوری سروس کے دوران ویکیشن جج رہا، سوائے چیف جسٹس شپ کے، جس دوران میں نے اپنے دوسرے ساتھیوں کو یکے بعد دیگرے ویکیشن جج مقرر کیا تھا۔ سال 1992 یا 1993 کی بات ہے، جب میں ویکیشن جج تھا، میرپور سے تعلق رکھنے والے ایک ٹھیکیدار جو ملٹری کے لیے گوشت مہیا کرتے تھے، کے دو ملازم جورا آٹھ مقام سے غائب ہو گئے۔ ان کے رشتہ دار نے میرے پاس حبس بے جا کی ایک درخواست ISI کے اہلکاروں کے خلاف دائر کی کہ انہوں نے ان کو اغوا کیا ہے۔ یہ لوگ کورٹ کا نوٹس وصول کرنا اپنی توہین سمجھتے ہیں اور عدالتی اہلکار کو اپنے احاطہ میں داخل ہی نہیں ہونے دیتے۔ سرکاری وکلا کو خاطر میں نہیں لاتے اور ان کو کسی قسم کی اطلاع نہیں دیتے اور نہ ہی ان سے تعاون کرتے ہیں۔ میں نے ISI ہیڈ کوارٹر کو الزام کی تفصیل مع کورٹ نوٹس بھیجا جس پر مقامی ISI کے نمائندے نے عدالت میں آ کر ان لوگوں کی گرفتاری یا نظر بندی سے انکار کر دیا۔

اگلے ہی روز درخواست گزاروں نے عدالت میں ایک درخواست دی کہ محبوسین میں سے ایک سی ایم ایچ مظفر آباد میں زیر علاج ہے۔ اس درخواست پر میں نے سیشن جج مظفر آباد کو حکم دیا کہ اس شخص کا بیان ہسپتال میں جا کر ریکارڈ کر کے عدالت میں پیش کرے اس پر ان لوگوں میں ہلچل پیدا ہو گئی۔ اسی شام میرے پاس ISI کے ایک انچارج کرنل عمر نے ملاقات کی خواہش کی۔ ان کا بیٹا ظفر میرے بیٹے راشد کے ساتھ پڑھتا تھا اور یہ لوگ بہت ہی گہرے دوست تھے۔ دونوں خاندان ان کو اپنے ہی بچے سمجھتے تھے، البتہ ہماری فیملیز کا آپس میں تعارف نہیں تھا۔ میرے بیٹے کے ہاتھ پیغام بھیجا کہ وہ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ بڑے شوق سے آئیں لیکن کل آئیں۔ اس پر کرنل صاحب نے ذاتی طور پر فون کر کے اسی شام ملنے کے لیے وقت چاہا اور انتہائی مجبوری کا اظہار کیا۔

شام کو وہ میرے گھر آئے اور بغیر لگی لپٹی اقرار کیا کہ وہ شخص ہماری تحویل میں ہے لیکن کسی شدید بیماری کی وجہ سے ہسپتال میں داخل ہو گیا ہے۔ اس لیے ہمیں دو دن کی مہلت دیں، جب تک وہ

بیان دینے کے قابل ہو جائے۔ میں نے ان کو کہا کہ یہی بات کل آپ لکھ کر عدالت میں پیش کریں۔ میں دوسرے وکیل کی موجودگی میں اس کا فیصلہ کروں گا اور اگر مہلت کی ہی بات ہے تو دوسرے فریق کو بھی کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ اگلے روز جب درخواست پیش ہوئی تو دوسرے فریق نے بھی بیان حلفی کے ساتھ ایک درخواست دی کہ اس شخص پر تشدد کیا گیا ہے جس کی وجہ سے وہ ہسپتال میں دم توڑ گیا ہے۔ اس پر میں نے ایس ایس پی مظفر آباد کو حکم دیا کہ وہ معاملہ کی انکوائری کر کے رپورٹ کرے اور اگر یہ واقعی سچ ہے تو ان لوگوں کے خلاف قتل کا مقدمہ درج کرے جو اس واقعہ کے ذمہ دار ہیں۔

مظفر آباد میں اس واقعہ کے خلاف شدید ردِعمل ہوا اور جلسے جلوس ہوئے لیکن معاملہ چوں کہ عدالت میں تھا اور عدالتی احکامات عوام کے جذبات کو ٹھنڈا کرنے کے لیے کافی تھے، اس لیے لوگ تشدد سے باز رہے۔ کرنل صاحب مجھ سے اجازت لے کر چیمبر میں ملے اور کہا کہ وہ شخص واقعی مر گیا ہے اور حالات ہمارے کنٹرول سے باہر ہو جانے کا اندیشہ ہے، اس لیے ہماری مدد کریں۔ ایک طرف تو معاملہ انتہائی حساس نوعیت کا تھا اور دوسری جانب ایک انسانی جان اور امن عامہ کا تھا جس کا تحت قانون اس کے علاوہ اور کوئی حل نہیں تھا کہ ملزموں کو پولیس کے حوالے کیا جائے اور ان کے خلاف قانون کے مطابق سلوک ہو جس کو ایجنسی والے لوگ ہضم کرنے کو تیار نہیں تھے۔ میں نے کرنل صاحب کو کہا کہ میں آپ کی یہ مدد کر سکتا ہوں کہ آپ کو مقتول کے ورثاء کے ساتھ معاملہ طے کرنے کے لیے وقت دوں اور کل تک مقدمہ کی سماعت ملتوی کر دوں۔ وہ اس پر آمادہ ہو گئے۔ ان لوگوں نے مقتول کے ورثاء کی منت سماجت اور لاکھوں روپے کا معقول خون بہا دے کر راضی کر لیا جس پر عدالت میں درخواست پیش ہوئی کہ وہ لوگ اس معاملے میں مزید پیش رفت نہیں کریں گے۔ اس طرح آمدہ بود بلائے ولے بخیر گزشت والی بات ہو گئی۔ انصاف کے تقاضے تو پورے ہو گئے' لیکن قانون اور لوگوں کی خواہش کے تقاضے پورے نہیں ہو سکے۔ ہمارے ملک میں اکثر ایسا ہی ہوتا ہے۔ تاہم یہاں انصاف کے تقاضے مروجہ قانون کے مطابق اس طرح پورے ہوئے کہ تحت شریعت مقتول کے ورثاء کو خون بہا کی مقررہ رقم سے زیادہ رقم مل گئی اور اس کے بعد دوبارہ ایسا معاملہ کبھی نہیں ہوا۔ آزاد کشمیر کیا بلکہ ملک بھر کے لیے

آئی ایس آئی ایسی ہی حیثیت رکھتی ہے جیسا حکومت پاکستان کے لیے سی آئی اے جس کا ایجنٹ ریمنڈ ڈیوس تین لوگوں کے قتل کے باوجود دیت کی رقم دے کر باعزت واپس امریکہ بھیجا گیا۔

شوکت کشمیری کیس:

اسی نوعیت کا ایک اور کیس اسی ایجنسی کے خلاف میرے پاس غالباً 98-1997 میں پیش ہوا۔ اس کیس میں راولاکوٹ سے تعلق رکھنے والے ایک شخص شوکت کشمیری کو مبینہ طور پر ISI کے لوگوں نے راولاکوٹ کے مضافات سے زبردستی اغوا کر لیا۔ شوکت کشمیری خود مختار کشمیر کے حامی لیڈر تھے جن کو پاکستان میں علیحدگی پسند کہا جاتا ہے۔ مجھے آج تک اس بات کی سمجھ نہیں آئی کہ آزاد کشمیر کے ایسے نظریات والے لوگوں کو علیحدگی پسند کیوں کہا جاتا ہے جب پاکستان کا یہ آئینی اور سیاسی موقف ہے کہ آزاد کشمیر پاکستان کا حصہ نہیں ہے تو کس سے علیحدگی ہو رہی ہے؟ اپنا Status improve کر کے اگر ایسا کیا جائے تو بات بنتی ہے وگرنہ نہیں۔ ان کو مبینہ طور پر گاڑیوں اور موٹر سائیکلوں پر سوار کچھ لوگوں نے ایک ویران سڑک پر گھیر کر اغوا کر لیا۔ ان میں سے دو گاڑیوں اور ایک موٹر سائیکل کا نمبر بھی جس بے جا کی درخواست میں درج کر کے عدالت کے روبرو پیش کیا گیا، یہ الزام بھی لگایا کہ اغوا کرنے والے دو اشخاص کو شناخت کیا جا سکتا ہے جو راولاکوٹ میں ISI کے ملازم ہیں۔ میں نے ان کے نام نوٹس جاری کیا اور انہوں نے حسب معمول نوٹس وصول کرنے سے انکار کر دیا۔ جب ان کی ہائی کمانڈ کو لکھا گیا تو ان کا ایک نمائندہ پیش ہوا جس نے اس وقوعہ سے بالکل انکار کر دیا۔ اس کے برعکس کئی لوگوں نے بیان حلفی پیش کیے کہ وہ ان لوگوں کو پہچان سکتے ہیں اور ان گاڑیوں کی بھی شناخت کر سکتے ہیں جو اس وقوعہ میں استعمال ہوئیں۔ اس پر میں نے انسپکٹر جنرل پولیس آزاد کشمیر کو حکم دیا کہ اس معاملہ میں کیس رجسٹر کر کے بیان حلفیوں کی روشنی میں تفتیش کرتے ہوئے مقررہ تاریخ پر رپورٹ عدالت میں پیش کی جائے۔

راولاکوٹ سیاسی اور انتظامی طور بہت ہی حساس علاقہ ہے۔ یہاں لوگ بے باک، جرأت مند اور نڈر ہیں۔ پاکستانی فوج میں آزاد کشمیر کے لوگوں میں سے زیادہ تر اسی علاقے کے لوگ ہیں اسی

لیے یہاں کے معاملات سے مرکزی حکومت بھی چشم پوشی نہیں کر سکتی۔ ان کو 1950 تا 1955 میں اس صورتِ حال سے گزرنا پڑا ہے۔ مقدمہ کی اگلی تاریخ پر شوکت کشمیری خود عدالت میں پیش ہوا اور اپنی گرفتاری، حراست اور رہائی کی ایک لمبی داستان پر مبنی بیان حلفی پیش کیا اور ان لوگوں کے خلاف قانونی چارہ جوئی کی استدعا کی۔ میں نے یہ سارے کاغذات معہ بیان حلفی اور عدالتی حکم متعلقہ ایجنسی کے ہیڈ کوارٹر میں برائے ضروری کارروائی بھیج دیئے۔ تاہم درخواست اس بنا پر خارج کر دی کہ شوکت کشمیری رِہا ہو گیا ہے، اس لیے حبس بے جا کی درخواست بے اثر ہو گئی ہے۔ میں نے عدالت میں ریمارکس دیتے ہوئے شوکت کشمیری اور آئی ایس آئی کے انچارجز کو کہا کہ بقیہ فیصلہ اللہ کی عدالت کرے گی جو سب سے بڑی عدالت ہے۔ پاکستان ہی کیا دنیا بھر میں سکیورٹی ایجنسیز ملک کے کان اور آنکھیں ہوتی ہیں۔ ان کی تذلیل یا سبکی کرنا مناسب نہیں ہوتا، لیکن ان کو بھی اللہ کا خوف کرنا چاہیے۔ حب الوطنی کے صرف وردی والے ہی ٹھیکیدار نہیں ہوتے، یہ سب شہریوں کے ایمان کا حصہ ہوتی ہے۔ اس لیے خواہ مخواہ لوگوں پر شک نہیں کرنا چاہیے نہ ہی کسی کو بدوں مقدمہ چلائے یا وجوہات بتائے اسیر بنانا چاہیے۔

اس کیس کے سلسلے میں شوکت کشمیری کے عدالت میں پیش ہونے سے قبل 20 مئی 1998 کو میرے چیمبر میں I.S.I, I.B. اور M.I. کے لوکل انچارج ملے جو غالباً کرنل رینک کے لوگ تھے اور انہوں نے شوکت کشمیری کی وطن دشمنی کے افسانے سنائے۔ ان لوگوں کی باتوں سے محسوس ہوا کہ ان کو شوکت کشمیری کی بے باکی اور قادر الکلامی سے ناراضی ہے، وگرنہ وطن دشمنی کا ان کے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا اور نہ ہی انہوں نے ایسا کچھ کہا کہ شوکت نے پاکستان کے خلاف کسی دشمن سے ساز باز کر کے نقصان پہنچانے کا منصوبہ بنایا، الا یہ کہ یہ لوگ ہندوستان سے پیسے لیتے ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ جب آزاد کشمیر پاکستان کا حصہ ہے ہی نہیں تو وطن دشمنی کیسی؟ اس کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ دراصل ایجنسیز والے لوگ ان کی سرگرمیوں پر اٹھنے والے اخراجات سے اندازہ لگا رہے تھے، ورنہ ان کے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا۔ تاہم انہوں نے اس کی گرفتاری اور نظر بندی سے صریحاً انکار کیا۔ ان لوگوں نے میرے وائس چانسلر کے عرصہ کو بہت سراہا اور کہا کہ ان کی خواہش تھی کہ میں یہاں کافی عرصہ تک

رہتا۔ چوں کہ چند دن قبل ہندوستان نے ایٹمی دھماکے کیے تھے، اس لیے یہ بات بالخصوص موضوع بحث رہی اور ہر کوئی قیاس آرائی کر رہا تھا کہ کیا پاکستان بھی ایسا کر سکتا ہے۔ ان لوگوں کی معلومات بھی مجھ سے زیادہ نہیں تھیں البتہ ہم سب لوگ پُرامید تھے کہ یقینی طور پاکستان بھی اس کا بھرپور جواب دے گا اور الحمد اللہ 28 مئی 1998 اور 30 مئی 1998 کو اس کا بھرپور جواب دیا گیا۔ اس کے کچھ ہی عرصہ کے بعد شوکت کشمیری کو حراست میں رکھنے والی ایجنسی نے غالباً اس کو ڈیرہ اسماعیل خان یا ڈیرہ غازی خان میں چھوڑا، جس کی تفصیل اس نے اپنے بیان حلفی میں دے رکھی تھی۔

اسی طرح کی کئی اور درخواستیں آئی ایس آئی، ایف آئی یو اور ایم آئی کے خلاف میرے روبرو پیش ہوتی رہیں۔ الحمد اللہ متاثرین کو انصاف تو ملتا رہا لیکن تماش بین جو کچھ دیکھنا چاہتے تھے، میں نے وہ تماشا نہیں ہونے دیا۔ عدالتوں کا کام انصاف مہیا کرنا ہے سیاسی بحران پیدا کرنا یا نمود و نمائش کی ڈرامے بازی کرنا نہیں ہے جس میں بالآخر اداروں کے درمیان کشیدگی پیدا ہوتی ہے۔ ہماری عدالتیں ہی نہیں بلکہ سارے ادارے اپنے دائرہ کار کے اندر کام کرنے کی بجائے اپنی حدود سے تجاوز کر رہے ہیں جس کا خمیازہ سرزمین پاکستان اور یہاں کے غریب لوگوں کو بھگتنا پڑتا ہے۔ چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری کے دَور میں پاکستان میں آئی ایس آئی کی حراست سے لوگوں کو رِہا کرانے کے لیے بہت شور وغوغا ہوا جبکہ آزاد کشمیر میں کچھ عرصہ قبل تک لوگوں کی گرفتاریاں اور رہا ہونا معمول کا معاملہ تھا۔ عدالتیں اپنا کام کرتی ہیں اور ایجنسیاں اپنا۔ یہاں بغیر شور شرابے کے لوگوں کو ریلیف مل جاتا رہا جبکہ پاکستان میں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے اور سیاست کی نذر ہونے کی وجہ سے کچھ نہیں ہوا۔

جج کو صبر و برداشت، عفو و درگزر کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ اسی صورت میں جج انصاف کر سکتا ہے۔ 94-1993ء کی بات ہے کہ اپنے آشنا کے ساتھ بھاگ جانے والی لڑکی طلبی پر میری عدالت میں پیش ہوئی اور دوست کے ساتھ جانے پر اقرار کیا۔ فریقین کو سننے کے بعد میں نے حکم دیا کہ لڑکی 72 گھنٹوں کے لیے دارالفلاح میں رہے گی جس کے بعد میں اس کا بیان قلم بند کروں گا۔ مقررہ تاریخ پر لڑکی پرانی بات پر ڈٹی رہی کہ وہ دوست جس کے ساتھ اس کا نکاح ہو چکا تھا، اسی کے ساتھ جائے گی،

لیکن میں نے اس سے کہا کہ وہ کچھ عرصے اپنے ننھیال رہے جس کے بعد اس کا باپ خود رخصتی کر کے اس شخص کے ساتھ بھیجے گا۔ لیکن لڑکی پر عشق کا بھوت سوار تھا، اس نے عدالتی ڈائس پر چڑھ کر میرا گریبان پکڑ لیا۔ مارنے لگی تھی لیکن پولیس اور وکلا نے بیچ بچاؤ کر دیا۔ مجھے اس کے خلاف کارروائی کرنے پر بہت اکسایا گیا لیکن میں نے معاف کر دیا کہ اس نے ایسا شدتِ جذبات میں کیا ہے۔ لیکن شرط یہی رکھی کہ نانا کے ساتھ جائے اور اس کی رخصتی اسی لڑکے کے ساتھ ہو۔ ویسا ہی ہوا۔ میری توہین تو ضرور ہوئی لیکن ماں باپ اور خاندان کی عزت بھی بچ گئی اور لڑکی کو پسند کا شوہر بھی مل گیا۔

بطور وائس چانسلر

جج ہائی کورٹ ہونے کے دوران مجھے سال 1996 میں آزاد جموں وکشمیر یونیورسٹی کے قائم مقام وائس چانسلر کا چارج بھی دیا گیا۔ ہوا یوں کہ سرور عباسی صاحب جو آزاد کشمیر یونیورسٹی کے تقریباً آٹھ سال وائس چانسلر رہے، کی مدت ملازمت کے اختتام پر ان کی جگہ آزاد کشمیر کے ایک سینئر بیورو کریٹ طارق مسعود، جو اس وقت ایڈیشنل چیف سیکریٹری اور ریٹائرمنٹ کے قریب تھے، کو یونیورسٹی کا وائس چانسلر مقرر کیا گیا۔ یونیورسٹی کا ماحول پہلے ہی کافی آلودہ، بے ربط اور غیر منظم تھا، اس تقرری نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ یونیورسٹی کے اکیڈمک اور ایڈمنسٹریٹو سٹاف نے ہڑتال شروع کر دی۔ ان لوگوں نے اپنے ناجائز مطالبات پیش کر رکھے تھے جو سابقہ وائس چانسلر صاحب کے وقت سے چلے آ رہے تھے۔ طارق مسعود صاحب کو ان ہڑتالوں نے بے بس کر دیا اور انہوں نے استعفیٰ دے دیا۔ مجھے اس وقت کے صدر جو یونیورسٹی کے چانسلر بھی ہوتے ہیں، سردار محمد ابراہیم صاحب مرحوم نے کہا کہ کچھ عرصہ کے لیے میں یہ کام کروں جب تک یونیورسٹی کے لیے کوئی ہمہ وقتی قابل قبول وائس چانسلر میسر نہیں آ جاتا۔ سردار صاحب اس طرح بات کرتے تھے جیسے ایک باپ اپنے چھوٹے بچوں کو سمجھاتا ہے، اس لیے لوگ ان کی باتوں میں آ جاتے تھے۔ اس میں وہ لگی لپٹی یا منافقت بھی نہیں کرتے تھے۔ میں نے اس شرط پر یہ بات مان لی کہ میں یونیورسٹی میں کچھ بہتری لانا چاہتا ہوں، اگر حکومت کی جانب سے تعاون کی یقین دہانی کرائی جائے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ انہوں نے وزیر اعظم بیرسٹر سلطان محمود

چوہدری صاحب کو بھی مشاورت کے لیے اگلے روز بلایا اور دونوں نے مجھے بھرپور تعاون کی یقین دہانی کرائی۔ اس کے بعد میری تقرری کا نوٹیفکیشن جاری ہوا اور میں نے کام کرنا شروع کر دیا۔

میں نے اپنے کام کا معمول یوں مقرر کیا کہ صبح آٹھ بجے سے ساڑھے نو بجے تک یونیورسٹی کے دفتر میں بیٹھتا تھا اور اس کے بعد عدالت عالیہ کا کام کرتا تھا۔ شام چار بجے کے بعد دوبارہ یونیورسٹی میں اس وقت تک کام کرتا تھا جب تک کہ ضرورت ہوتی اور دن بھر کے سارے کام ختم نہ ہو جاتے۔ یونیورسٹی کے اکیڈمک اور ایڈمنسٹریٹو سٹاف نے میرے ساتھ بھرپور تعاون کیا اور ان کے مشورے اور مدد سے ایک پروگرام چاک آؤٹ کیا جس کی تکمیل کی ذمہ داری مختلف لوگوں کو دی گئی۔ اس وقت یونیورسٹی میں پروفیسر راجہ آزاد رجسٹرار، سردار خضر حیات کنٹرولر امتحانات، پروفیسر خانی زمان مرزا کشمیر ریسرچ سینٹر کے انچارج اور انتہائی متحرک لوگ تھے۔ میرے ان کے ساتھ کافی عرصہ سے تعلقات بھی چلے آ رہے تھے کیوں کہ سابق وائس چانسلر ڈاکٹر سرور عباسی جو میرے دوست بھی تھے، ان کے حوالے سے ان لوگوں سے اکثر ملاقاتیں ہوا کرتی تھیں۔ میں نے تمام شعبوں کے ساتھ الگ الگ مشاورتی اجلاس کیے۔

یونیورسٹی کے مختلف کیمپس آزاد کشمیر کے مختلف اضلاع میں پھیلے ہوئے ہیں، اس لیے ہر کیمپس کا دورہ کر کے موقع پر ان کی کارکردگی کا جائزہ لینے کے علاوہ ان کی مشکلات اور ضروریات کا اندازہ بھی لگایا۔ یہ سارا سروے مکمل کرنے کے بعد میں نے سب سے پہلے تو مظفر آباد شہر کے ہر کونے میں پھیلے یونیورسٹی دفاتر کو اکٹھا کرنے کا فیصلہ کیا جس کے لیے چہلہ بانڈی میں یونیورسٹی کیمپس میں زیر تعمیر بلڈنگز کی فوری تکمیل پر توجہ دی جس میں اکیڈمک بلاک اور رہائشی کالونی شامل تھے۔ اس جگہ دو بلڈنگز تکمیل کے تقریباً آخری مرحلہ میں تھیں جن میں سے ایک سٹوڈنٹ ٹیچر سینٹر اور دوسری لائبریری تھی جس کو کشمیر ریسرچ سینٹر کہتے تھے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ یونیورسٹی ایڈمنسٹریشن کے دفاتر شہر میں جہاں جہاں بھی ہیں، ان کو ان دو بلڈنگز میں جمع کیا جائے۔ اس کے لیے ان کی اندرونی ڈیزائننگ ایسی کرائی گئی کہ تمام انتظامی دفاتر ماسوائے کنٹرولر امتحانات کے اس کے اندر سمو گئے۔ بلڈنگ کے بڑے بڑے

کمروں کو عارضی پارٹیشن سے چھوٹے چھوٹے کمروں میں تقسیم کیا گیا اور اپنے لیے سب سے چھوٹا کمرا مختص کیا۔ یونیورسٹی نے شہر کے اندر تقریباً اٹھارہ بلڈنگز کرایہ پر لے رکھی تھیں جن کا سالانہ تقریباً 30 لاکھ روپے کرایہ دیا جاتا تھا۔ تمام مالکان کے ایک مہینے کے نوٹس کے بعد مکان خالی کرا دیئے اور ان سب کو چہلہ بانڈی کے مقام پر ایک ہی چھت کے نیچے جمع کیا گیا۔ سردار سکندر حیات خان نے اپنی صدارت کے دوران اپنی بلڈنگ بھی وائس چانسلر کے دفتر کے لیے کرایہ پر دی تھی، ان کی بلڈنگ بھی نہ صرف خالی کرائی بلکہ ایڈوانس وصول کردہ کرایہ کی رقم بھی واپس لی۔ یہ اپنی نوعیت کا انوکھا واقعہ تھا لیکن قومی مفاد میں جب کوئی کام کرنا ناگزیر ہو تو انجام کی پرواہ کیے بغیر ایسا کر لینا چاہیے۔ اگر مقصد نیک ہو تو ذرائع خود بخود کامیابی کی طرف لے جاتے ہیں۔

ہر بلڈنگ کے اندر کئی کئی ٹیلی فونز لگے تھے جن کے الگ طور لاکھوں روپے کے اخراجات ہوتے تھے۔ ان سب کی جگہ ایک ایکسچینج لگا کر سب کو اس کے ساتھ منسلک کیا۔ ان کے لیے ٹرانسپورٹ اور ڈاک رسانی کے لیے وقت اور روپے کا الگ نقصان ہوتا تھا۔ عام لوگ اور طلبا کو ایک کام کروانے کے لیے مختلف شعبوں میں شہر کے مختلف کونوں میں جانا پڑتا تھا، وہ سارا ایک جگہ مرکوز ہو گیا۔ ایک ہی مہینہ کے اندر اتنی بڑی تبدیلی آ گئی کہ لوگوں اور سٹاف کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ حکومت آزاد کشمیر اور مرکزی حکومت نے بھرپور مالی اعانت کی جس سے لائبریری کے لیے کتب اور یونیورسٹی کے تمام شعبوں بالخصوص کمپیوٹر سینٹر کے لیے کمپیوٹرز خریدے گئے جو ہر ایک کیمپس کو پورے آزاد کشمیر میں ان کی ضرورت کے مطابق دیئے گئے۔

جب یونیورسٹی کے تمام دفاتر چہلہ بانڈی کیمپس میں جمع ہو گئے تو میں نے مرحوم پروفیسر خانی زمان مرزا کی ذمہ داری لگائی کہ وہ آزاد کشمیر کے تمام نامور لیڈروں کی ایک کانفرنس کشمیر سینٹر میں بلائیں۔ یہ نام کا کشمیر سینٹر محض بلڈنگ کا ایک ڈھانچا تھا، جس پر کشمیر سینٹر بورڈ لگا تھا۔ بہرحال ہم لوگوں نے کوشش کر کے 27 مارچ 1997 کو اس کیمپس میں آزاد کشمیر کے تمام لیڈروں کو معہ صدر ریاست سردار محمد ابراہیم خان صاحب کے جمع کیا۔ تاہم اس میں وزیراعظم بیرسٹر سلطان محمود صاحب شریک نہ

ہو سکے۔ یونیورسٹی میں پہلی مرتبہ یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلباء کو آزاد کشمیر کے حکمرانوں اور لیڈروں کے آمنے سامنے اکٹھا کیا۔ لوگوں کو ایک دوسرے کو سنانے اور سننے کا موقع ملا۔

حکومتی اور ملکی پالیسیاں دنیا بھر میں یونیورسٹیوں کے تھنک ٹینک ہی بناتے ہیں لیکن ہمارے ملک میں استاد محض تنخواہ کی خاطر ہی ملازمت کرتے ہیں اور حکومت بھی ان کو چپڑاسیوں، کلرکوں اور سیکریٹریوں کی طرح اپنا ملازم سمجھتی ہے اور ان کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کرتی۔ ہماری یونیورسٹی کے کئی پروفیسرز جن میں عبدالرزاق بھٹی، پروفیسر خیرایت، پروفیسر عبدالحلیم اور پروفیسر رؤف پاکستان اور دنیا کی دیگر یونیورسٹیوں میں متعین ہوئے اور یہ اس وقت ممکن ہوا جب ان لوگوں کو میں نے وہاں جانے کی NOC جاری کی۔ اس سے پہلے ان کو محض اس لیے نہیں جانے دیا گیا کہ ان کا متبادل یونیورسٹی میں نہیں ہے، حالاں کہ کوئی بھی ناگزیر نہیں ہوتا۔ دنیا بھر کے قبرستان اپنے زمانے کے ناگزیر لوگوں سے بھرے پڑے ہیں۔ ان لوگوں نے باہر جا کر علاقے کا اور اپنا نام روشن کیا جب کہ نئے لوگوں نے اس یونیورسٹی میں اپنے جوہر دکھائے۔

یونیورسٹی کے ملازمین اور اکیڈمک سٹاف کے سلیکشن بورڈ اور اساتذہ کی خالی آسامیوں کے خلاف تقرریوں کے فوری اقدامات کیے گئے۔ ان کے آپس میں سروس کے تنازعات اور اپیلوں کو یکجا کر کے ان کا فیصلہ کیا اور سارے معاملات حل کروائے۔ یونیورسٹی انتظامیہ کو میں نے حکم دے رکھا تھا کہ ہر روز کا کام ختم کر کے دفتر سے نکلنا ہے اور کوئی کام کل پر نہیں چھوڑنا ہے۔ ایک مرتبہ رات کے گیارہ بجے میں اپنے یونیورسٹی کے دفتر سے گھر کے لیے نکلا تو انتظامیہ کے لوگوں کو میں نے اپنے اپنے ڈیسک پر کام کرتے ہوئے دیکھ کر معذرت کی کہ آپ کو میری وجہ سے اتنی دیر تک بیٹھنا پڑتا ہے۔ اس پر ایک آفیسر نے کہا کہ سر ہمیں شرمندگی ہو رہی ہے کہ ہم اپنا کام وقت پر ختم نہیں کر سکے جس کے لیے اتنی رات گئے تک ہماری وجہ سے آپ کو بھی بیٹھنا پڑتا ہے۔ یہ بات میرے لیے بہت ہی حوصلہ افزا تھی۔

طالبات کے ہاسٹل شہر میں مختلف جگہوں پر نجی عمارات میں بنائے گئے تھے جو طالبات اور ان کے والدین کے لیے پریشانی کا باعث تھے۔ کئی جگہوں سے شکایات موصول ہو رہی تھیں جس وجہ

سے میں نے فیصلہ کیا کہ گرلز کالج مظفر آباد کے احاطہ میں موجود یونیورسٹی ہاسٹل کو اس طرح منظم کیا جائے کہ تمام ہاسٹلز میں رہنے والی طالبات اس میں سما جائیں۔ یہ کام بہت مشکل تھا لیکن شہریوں اور انتظامیہ کے تعاون سے ممکن ہو گیا اور یونیورسٹی کی تمام طالبات کو ایک ہی ہاسٹل میں منتقل کر دیا گیا۔

جب ایک انسان کو اس کا حق بغیر کسی پریشانی کے وقت پر مل جائے تو وہ دل و جان سے اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے میں مستعد ہو جاتا ہے اور اپنے وقت سے زیادہ وقت دینے میں خوشی محسوس کرتا ہے۔ یہی حال یونیورسٹی کے ملازمین کا ہوا۔ جب ان لوگوں کو ان کے جائز حقوق بروقت مل گئے تو انہوں نے میرے ساتھ بھرپور تعاون کیا۔ کسی شخص کو یہ گمان تک بھی نہ گزرتا تھا کہ اس کو حق مانگنے یا مطالبے کی صورت میں ہی ملے گا یا یہ کہ نہیں ملے گا۔ اس لیے ادارے پر لوگوں کا بھرپور اعتماد بحال ہوا۔ چوں کہ یہ میرا آبائی محکمہ نہیں تھا جہاں میری کسی کے ساتھ یا کسی کی میرے ساتھ رقابت یا مفادات کا ٹکراؤ ہوتا، اس لیے نہ تو مجھے کام کرنے میں مشکل پیش آئی اور نہ ہی لوگوں کو میرے ساتھ تعاون کرنے میں۔

یونیورسٹی کے اندر ان دنوں دو ملازم شوکت حنیف میر صدر ایڈمنسٹریٹو سٹاف ایسوسی ایشن اور میجر محمد رفیق درانی صدر آفیسرز ویلفیئر ایسوسی ایشن ایسے تھے جو ہر بات پر غصے میں اور فساد پر اتر آتے تھے۔ من مانیاں کرتے، اپنا کام نہ تو کرتے تھے اور نہ ہی وقت پر آتے تھے۔ اساتذہ اور انتظامیہ کے ساتھ ان کا برتاؤ نامناسب اور ناشائستہ تھا۔ میں نے تو ان سے بھرپور کام لیا، البتہ میں نے پیش گوئی کر رکھی تھی اور ان کو کہہ دیا تھا کہ اگر آپ نے اپنا رویہ نہ بدلا تو آپ کو یونیورسٹی سے یقیناً برطرف کر دیا جائے گا۔ اتفاق کی بات ہے کہ ان ہی دو لوگوں کو میرے بعد آنے والے وائس چانسلر خلیل احمد قریشی صاحب نے نوکری سے برطرف کر دیا۔ خلیل قریشی صاحب نے یونیورسٹی میں ایک نئی جان ڈال دی۔ کئی نئی عمارات کی تعمیر کو یقینی بنایا، نئے قواعد و ضوابط وضع کیے جس کی وجہ سے نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں میں بھرپور اضافہ ہوا۔

یونیورسٹی انتظامیہ کے سربراہ کے طور پر مجھے تین غیر معمولی واقعات کا سامنا کرنا پڑا جو حکومت، چانسلر مرحوم سردار محمد ابراہیم خان صاحب اور چند دیگر سیاست دانوں کے حوالے سے ہیں۔

134

میں نے یونیورسٹی انتظامیہ کو سٹریم لائن کرنے کے لیے one man one office کے اصول کے تحت سردار خضر محمد خان نامی ایک پروفیسر جو بہ یک وقت باٹنی ڈیپارٹمنٹ کے سربراہ ہونے کے علاوہ یونیورسٹی میں کنٹرولر امتحانات تھے، کو کنٹرولر امتحانات کے شعبہ سے فارغ کر کے ہمہ وقتی شعبہ باٹنی کا ہیڈ مقرر کیا اور کنٹرولر حبیب الرحمان نامی ایک پروفیسر کو مقرر کیا جو بعد ازاں وائس چانسلر کے طور خدمات انجام دیتے رہے۔ خضر محمد میرے ایک وکیل دوست سردار رفیق محمود صاحب کے بھائی اور سردار ابراہیم خان صاحب صدر ریاست اور چانسلر یونیورسٹی کے قریبی عزیز تھے۔ اس کے علاوہ ان کی سردار عتیق احمد خان اور سرور عباسی سابقہ وائس چانسلر وغیرہ سے بھی رشتہ داری تھی۔ اسی رات سردار محمد ابراہیم صاحب نے مجھے راولاکوٹ سے فون کر کے کہا کہ گیلانی صاحب خضر صاحب کا تبادلہ آپ نے منسوخ کرنا ہے، یہ میرا عزیز ہے، میں اپنی برادری کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ میں نے ان سے کہا کہ میں ذاتی طور پر آپ سے مل کر بات کروں گا۔ اس کے اگلے روز عتیق احمد خان کے ایک گروپ نے یہی مطالبہ کیا۔ صدر صاحب نے اگلے روز دوبارہ فون کر کے کہا کہ آپ نے حکم منسوخ کیا یا نہیں جس پر میں نے معذرت کی کہ یہ یونیورسٹی کی وضع کردہ پالیسی کے خلاف ہے۔ میرے لیے ایسا کرنا ممکن نہیں ہو سکتا وگرنہ میری ایڈمنسٹریشن collapse ہو جائے گی اور میری انتظامی گرفت ختم ہو جائے گی۔ مجھے علی گڑھ یونیورسٹی کے اپنے ایک پروفیسر کی بات ذہن پر چھائی ہوئی تھی۔

You must have courage to say no but if you say yes, you must mean it at the cost of your life.

میں نے سردار محمد ابراہیم خان صاحب جیسے بڑے آدمی کی بات کو ہمت اور جرأت سے ''نو'' کہا۔ حالاں کہ سردار صاحب کی ذاتی حیثیت ہو یا سرکاری ان کی بات کو ٹالنا کسی کے بس کی بات نہ تھی۔ اس پر سردار صاحب نے مجھے کہا کہ میں بحیثیت چانسلر کیا کر سکتا ہوں۔ میں نے ان کو کہا کہ سر آپ مجھے ہٹا سکتے ہیں یا میں استعفیٰ دے سکتا ہوں۔ سردار صاحب نے مجھے اپنے مخصوص انداز میں کہا کہ ''نہیں گیلانی صاحب نہیں، خضر کے مقابلے میں آپ کا یہاں رہنا زیادہ ضروری ہے۔'' اور اس کے

بعد انہوں نے دوبارہ مجھے کبھی کچھ نہیں کہا بلکہ یہ بات بڑے اصرار سے کئی جگہوں پر میری تعریف و توصیف میں دہرائی۔ آزاد کشمیر میں یہ بڑا پن میں نے ان ہی میں دیکھا۔

اسی زمانے میں رمضان شریف کے مہینے میں رات کے تقریباً گیارہ بجے دو آدمی میرے گھر آئے۔ میرے گارڈز نے میرے ملازم کو کہا کہ پرائم منسٹر بیرسٹر سلطان صاحب کا بیٹا یا سر اور ان کے ساتھ ایک اور آدمی ہے۔ میں نے ان کو کہا کہ کل آئیں۔ لیکن میری اہلیہ نے مجھے کہا کہ یہ لوگ اس شدید بارش میں آئے ہیں اور وزیر اعظم کا بیٹا ہے، اخلاقیات کا تقاضا ہے کہ آپ ان سے مل لیں جس پر ان کو اندر بلایا گیا۔ ان کے بیٹے نے مجھے ایک درخواست نکال کر دی جس پر وزیر اعظم بیرسٹر صاحب نے نوٹ لکھا تھا کہ کہ ''درخواست گزار کو وزیر اعظم کے کوٹہ کے خلاف میر پور انجینئرنگ کالج میں داخلہ دیا جاتا ہے۔ احکامات جاری کریں۔'' میں نے درخواست اپنے پاس رکھ لی اور ان کو کہا کہ ایسا ممکن نہیں ہے کیوں کہ ایک تو وزیر اعظم کا کوئی کوٹہ ہی نہیں ہوتا اور اگر ہو بھی تو اس پر بھی میرٹ پر داخلہ ہو گا۔

میں نے اس لڑکے کو کہا کہ آپ نے بھی سردار عتیق احمد خان کی طرح اپنے باپ پر حرف لانے کی ٹھان لی ہے اور اپنے دادا سے کوئی سبق نہیں سیکھا۔ اس نے کہا، جناب میں سمجھا نہیں۔ میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا کہ بیٹا آپ کے دادا چوہدری نور حسین آزاد کشمیر کے صف اوّل کے سیاست دانوں میں سے تھے لیکن جب سے بیرسٹر سلطان محمود سیاست میں آئے، بڑے چوہدری صاحب سیاست سے ریٹائرڈ ہو گئے اور دونوں نے اپنی اپنی عزت بنالی۔ ایک نے ریٹائرڈ ہو کر اور دوسرے نے سیاست میں آ کر جبکہ سردار قیوم صاحب کے بیٹے سردار عتیق احمد نے اپنے باپ کے ہوتے ہوئے محیط ہونے کی کوشش کی جس کی وجہ سے سردار صاحب کی عزت بھی متاثر ہوئی اور عتیق احمد نے بھی عزت نہیں کمائی۔ کیا آپ بھی اپنے باپ کے ساتھ ایسا ہی کرنا چاہتے ہیں؟

وہ چلے گئے اور اگلے روز بیرسٹر صاحب سے میں نے یہ واقعہ بیان کیا۔ وہ بہت خوش ہوئے اور کہا کہ اس کو تھپڑ بھی مارنا تھا۔ چند دنوں کے بعد بیٹے کو انگلینڈ بھیج دیا۔ کچھ عرصہ بعد بیرسٹر صاحب مجھے

ایک جگہ ملے جہاں انہوں نے مجھے کہا کہ آپ نے میرے بیٹے کی بیرسٹری کرا دی۔ میں نے پوچھا کیسے؟ تو انہوں نے مجھے بتایا کہ اس واقعہ کے بعد میں نے اس کو باہر بھیج دیا جہاں اس نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ یہ بیرسٹر صاحب کی بڑائی ہے کہ اپنے دل میں رنجش رکھنے کی بجائے اس بات کی تحسین کی اور اپنے بیٹے کا مستقبل اور اپنی عزت بنالی۔

میرے جج ساتھیوں میں سے ایک کے سردار ابراہیم خان صاحب مرحوم کے ساتھ گہرے تعلقات تھے۔ انہوں نے میری مقبولیت کے حسد میں شکایت لگائی کہ میرے وائس چانسلر ہونے سے ہائی کورٹ کا کام متاثر ہو رہا ہے۔ یہ بات انہوں نے بہت ہی ایکسپلائٹ کی۔ سردار صاحب نے مجھے ان کے حوالے سے یہ بات خود کہی بھی، لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ اس کے باوجود میں فی الحال آپ کو یونیورسٹی سے فارغ نہیں کر سکتا کیوں کہ آپ نے اس کی سمت مقرر کر دی ہے۔

دیکھا جو کھا کے تیر کمین گاہ کی طرف
اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہو گئی

تیسرا ایک انتہائی حساس قومی نوعیت کا معاملہ پیش آیا۔ دو جہادی تنظیموں البدر اور حزب المجاہدین نے آئی ایس آئی کے ذریعے ہماری یونیورسٹی کے کیمپس میں چار روزہ تربیتی کنونشن منعقد کرنے کی اجازت مانگی جو میں نے نہیں دی۔ اس کی تفصیل کسی دوسری جگہ درج ہے۔

احتساب کمیشن اور احتساب

پاکستان میں میاں نواز شریف کی منتخب حکومت کو برطرف کر کے جنرل پرویز مشرف، چیف آف آرمی سٹاف ملک کے صدر بن گئے اور PCO جاری کر دیا۔ آزاد کشمیر میں آئینی طور پر کوئی تبدیلی نہیں لائی لیکن عملاً کنٹرول فوج کے پاس چلا گیا۔

ان دنوں مرکز میں چوں کہ احتساب کا بڑا شور شرابا تھا، لہٰذا آزاد کشمیر میں بھی اس سلسلہ میں سرگرمیاں شروع ہو گئیں۔ حکومت کو چیف احتساب کمشنر کی ضرورت تھی۔ اس سلسلے میں مختلف نام زیر

غور تھے جن میں سے جسٹس بشارت احمد شیخ صاحب اور میرا نام سرفہرست تھا۔ بشارت شیخ صاحب سے صدر صاحب غالباً کچھ تحفظات رکھتے تھے جو ان کے سیاسی پس منظر کی وجہ سے تھا۔ اس لیے بیرسٹر سلطان محمود صاحب نے خود اور سردار خالد ابراہیم صاحب نے صدر صاحب کی جانب سے میرے ساتھ رابطہ کیا۔ میں نے تو اس کے لیے صرف بشارت احمد شیخ صاحب کی ہی تجویز دی لیکن ان کے تحفظات کے باعث اس شرط پر یہ عہدہ قبول کرنے پر آمادگی کا اظہار کیا کہ اس قانون میں ایک کلاز ایسا شامل کیا جائے جس کے تحت چیف احتساب کمشنر کسی بھی شخص کے خلاف کرپشن کی کسی بھی نوعیت کے الزام کا از خود نوٹس لے کر کارروائی کرنے کا اختیار رکھتا ہو۔ لیکن حکومت نے اس بات سے اتفاق نہیں کیا۔ لہٰذا میں نے معذرت کر لی۔ اس پر جسٹس بشارت احمد شیخ کو ہی چیف احتساب کمشنر بنایا گیا۔ وہ کچھ عرصہ کے لیے وہاں رہے، لیکن اس نظام پر فوج کا غلبہ ہونے کی وجہ سے جلد ہی مستعفی ہو گئے۔

احتساب ہمیشہ اپنے مخالفین کا کیا جانا مطلوب ہوتا ہے تا کہ ان کو فکس اپ کیا جائے اور حکومت وقت سرکاری خرچ پر اپنی ذاتی اور سرکاری زندگی آسانی سے گزار سکے۔ اگر حکومتوں کا مقصد فی الواقع صاف ستھری اور کرپشن سے پاک انتظامیہ ہو تو احتساب ایک ہمہ وقتی خودکار عمل ہونا چاہیے جس میں کسی کو تحفظ حاصل نہیں ہونا چاہیے، جیسا کہ یورپ، امریکہ اور اب ہندوستان میں بھی یہ کلچر ترقی پذیر ہے۔ میں نے پاکستان کے اندر سارا عرصہ صرف حکومت مخالف لوگوں کو ہی احتساب کی زد بلکہ انتقام میں دیکھا اور احتساب زدہ شخص جس وقت حکومت وقت کی بیعت کرتا ہے، اسی روز پاک وصاف ہو کر حکومت کے صف اوّل کے شرفاء میں شامل ہو جاتا ہے۔ جنرل مشرف کی حکومت میں نواز شریف کے معتمد ترین اور اب نواز شریف کی حکومت میں جنرل مشرف کے معتمد ترین لوگوں کا کلیدی سیاسی پوزیشنز میں ہونا اس کی واضح دلیل ہے۔

آزاد کشمیر کے احتساب کمیشن نے سب سے پہلے 1992 کے سیلاب میں خرد برد کی گئی جنگل کی لکڑی کے بارے میں احتساب شروع کیا، جس میں سے آزاد کشمیر جنگلات کے دو نیک نام لوگوں خواجہ عثمان اور محمد یونس اعوان کو گرفتار کیا۔ ان کی ضمانت کا کیس میرے پاس سماعت کے لیے جب آیا تو

میں نے اس وقت کے چیف پراسیکیوٹر کو کہا کہ آپ نے نیک نام لوگوں سے احتساب شروع کر کے اس عمل کو شروع سے ہی ناکام بنا دیا۔ اگر راجہ عبدالقیوم خان جو اس وقت کے وزیر جنگلات تھے کو پکڑا ہوتا تو لوگ مان بھی سکتے تھے۔ میں نے دونوں کی ضمانت منظور کی۔ اسی وجہ سے فوجی بالخصوص جی او سی مری جنرل اشفاق کیانی میرے مخالف ہو گئے لیکن جب حقیقت عیاں ہوئی تو میرے ساتھ ان کے تعلقات بہت ہی خوشگوار ہوئے جو اس وقت سے آج تک جاری ہیں۔

ادھر مرحوم محمد یونس سرکھوی جو اس وقت سپریم کورٹ کے جج تھے، نے احتساب کمشنر بننے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگانا شروع کر دیا۔ مجھے بھی اس سلسلے میں انہوں نے درخواست کی اور اس کے لیے ہر شرط ماننے پر تیار ہو گئے۔ چنانچہ ان کو ہی بالآخر چیف احتساب کمشنر بنوایا گیا۔ مرحوم نے اپنے آپ کو سرکاری ملازم کے طور سمجھ کر ویسا ہی کرنا شروع کر دیا۔ جنرل پرویز مشرف کی حکومت کے دوران آزاد کشمیر کے معاملات پر مری میں بیٹھنے والے جنرل آفیسر کمانڈنگ کو فیصلہ کرنے کی مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ یونس سرکھوی مرحوم ان کے استقبال کے لیے ہیلی پیڈ اور ان کی بلائی ہوئی سرکاری ملازمین کی میٹنگز میں شامل ہوا کرتے تھے۔ وہ فخر سے کہتے تھے کہ وہ بحیثیت چیف احتساب کمشنر حکومت کے ملازم ہیں، اس لیے ایسی میٹنگز میں ان کی شمولیت ضروری ہے حالاں کہ وہ جج کی حیثیت سے چیف احتساب کمشنر تھے نہ کہ چیف احتساب کمشنر کی حیثیت سے جج۔

مرحوم نے اس ادارے کا بھرپور طریقے سے غلط استعمال کیا۔ خواہ مخواہ اور بدوں اختیار اپنے دوستوں تعلق داروں کو نوازنے اور فائدہ پہنچانے کے لیے سرکاری ملازمین کے خلاف کارروائی کرنا اور اس بلیک میلنگ میں اپنے کام کرانا شروع کر دیئے۔ ادھر حکومت وقت کے ساتھ بھی ساز باز کر رکھا تھا تا کہ ان کی آڑ میں اپنا کام جاری رکھ سکیں۔ ان کی اس حرکت کی وجہ سے سپریم کورٹ جیسے مقتدر ادارے کی ساکھ کو بہت نقصان پہنچا۔ احتساب کے کسی مقدمہ نے بھی عدالت میں کامیابی حاصل نہیں کی جس وجہ سے اس ادارے کی حیثیت نہ صرف متاثر بلکہ مشکوک ہو گئی۔ مجھے چیف احتساب کمشنر نہ بننے کے اپنے فیصلے پر بہت اطمینان ہوا کہ میری ساکھ مجروح ہونے سے بچ گئی۔ انسان دولت، اختیار،

رتبہ اور اقتدار تو حاصل کر لیتا ہے لیکن شہرت اور عزت حاصل کرنا اور اس کو بحال رکھنا محض توفیق ربی ہے جو صرف اسی صورت میں حاصل ہو سکتی ہے جب انسان نیت صاف رکھ کر بے لوث اور بے خوف طرزِ عمل اختیار کرے۔'' بے شک اللہ تعالی جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلیل و رسوا کرتا ہے۔''

ہائی کورٹ کے ججز، چیف جسٹسز اور چند حقائق

جس دوران میں ہائی کورٹ کا جج رہا مجھے تین چیف جسٹس صاحبان کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا عبدالمجید ملک، چوہدری شیر زمان اور خواجہ محمد سعید ان میں سے عبدالمجید ملک صاحب کا دورانیہ سب سے طویل تھا جو ستمبر 1984 سے ستمبر 1994 پر محیط تھا۔ موصوف اہلیت، قابلیت، علمیت اور جرأت والے انسان اور جج تھے۔ انہوں نے سارا عرصہ بے خوف ہو کر منصفی کی اور متعدد آئینی اور قومی اہمیت کے حامل مقدمات کا فیصلہ کیا۔ ان میں تحریک عمل پارٹی کا کیس جس کے تحت اس قانون کو کالعدم قرار دیا جس کے تحت ایک خاص تعداد کی حد تک ووٹ حاصل نہ کرنے کے باعث پارٹیز کی رجسٹریشن اور منتخب ممبران کی حیثیت ختم ہوتی تھی۔ یہ کیس قانونی جریدوں میں رپورٹڈ بھی ہے۔ شمالی علاقہ جات کا مقدمہ جس کے تحت ان علاقوں کو آزاد کشمیر کا حصہ قرار دے کر حکومت آزاد کشمیر کو ہدایت کی گئی تھی کہ اس کا انتظام و انصرام حکومت پاکستان سے حاصل کرے۔ ایڈہاک ملازمین کی بدوں سفارش پبلک سروس کمیشن مستقل تقرری کے قانون کو کالعدم قرار دیا۔ اس کے علاوہ بہت سے اہم اور عام نوعیت کے مقدمات کا فیصلہ کرنا بھی ان کا مقدر ہوا جن کی لوگوں میں بہت پذیرائی ہوتی رہی۔

لیکن ان کے عرصہ تعیناتی کے دوران سیاست اور عدالت کے درمیانی فاصلے سمٹ سے گئے۔ وہ ایک سیاسی لیڈر کے طور بیان بازی کرتے جلسوں اور سیاسی اور سماجی تقریبات میں شرکت کرتے، لوگوں سے تحفے تحائف وصول کرتے اور ہر کس و ناکس کی دعوت قبول کرنے میں ذرا تامل نہ کرتے۔ بیرون ملک دوروں اور وہاں عام لوگوں کی سیاسی اور سماجی تقریبات میں شرکت کر کے کھلم کھلا

سیاست کرتے، حکومت اور مخالفین پر بیانات داغنے سے کبھی اجتناب نہیں کیا[134]۔ موصوف اکثر کہا کرتے تھے کہ کسی جج کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کو عوام کتنی دعوتیں دیتی ہے حالاں کہ ججز کوڈ آف کنڈکٹ کے تحت یہ سارے معاملے بدمعاملگی کی تعریف میں آتے ہیں۔ ملک صاحب نے مستقبل میں سیاست کرنے کے ارادے سے ایسا کیا اور اس ارادے سے لوگوں کو نوازا بھی لیکن یہ ان کے کسی کام نہیں آیا۔

چوہدری شیر زمان صاحب ستمبر 1994 سے مارچ 1996 تک چیف جسٹس ہائی کورٹ رہے۔ موصوف کم آمیز اور کم گفتار جج تھے۔ اپنے کام سے کام رکھنا ان کا وطیرہ رہا۔ سخت طبیعت اور سخت گیر انسان تھے۔ قانون اور مقدمے کے واقعات کا صحیح ادراک رکھتے تھے۔ بڑے اور الجھے ہوئے مقدمات سے عموماً گریز کرتے تھے۔ کسی پیچیدہ اور سیاسی نوعیت کے مقدمے میں کبھی نہیں الجھے۔ ہر کس و ناکس کو سر پر نہیں چڑھایا اور ملک صاحب کے برعکس نمود و نمائش، تقریر بازی یا دعوتوں سے ہمیشہ اجتناب کیا۔ حکومت یا سسٹم سے متصادم کسی قابل ذکر مقدمہ کا فیصلہ کرنے کا سہرا حاصل نہیں کیا۔ حکومت وقت میں تو صدر اور وزیر اعظم کی حد تک تعلقات کے علاوہ کسی سے تعلقات نہیں رکھتے تھے۔ آزاد کشمیر کے چیف الیکشن کمشنر بھی رہے۔ 2001 کے آزاد کشمیر اسمبلی کے الیکشن ان کی سربراہی میں ہی ہوئے۔ ان کے خلاف کوئی قابل ذکر الزام نہیں لگا، سوائے اِکا دُکا ہارے ہوئے امیدواروں یا پارٹیوں کے روایتی الزامات کے۔

خواجہ محمد سعید صاحب مارچ 1996 سے اپریل 2002 تک چیف جسٹس ہائی کورٹ رہے۔ قادر الکلام شخص تھے جس مجلس میں بیٹھتے اور جس شخص کو ملتے وہ ان کی شرافت کا گرویدہ ہو جاتا۔ کبھی کسی کو ناراض نہیں کرتے تھے جو لوگ ان سے گہرا میل جول نہ رکھتے تھے۔ وہ ان کی باتوں سے بہت متاثر تھے۔ مجھے 1977 سے 2007 تک ان کے ساتھ بحیثیت وکیل اور جج مختلف مقدمات میں کام کرنے کا موقع ملا۔ موصوف نے شائستگی کو کبھی بھی نہیں چھوڑا۔ اس عرصہ کے دوران بدقسمتی سے ساتھی جج ایک دوسرے سے بدگمان رہے۔ میرے اور ریاض اختر صاحب کے درمیان غلط فہمیاں اور

کشیدگی عروج پر رہی۔ خواجہ صاحب کسی کے خلاف کوئی بات نہیں کرتے تھے۔ البتہ جس کے خلاف کرانا چاہتے ایسا ماحول پیدا کرتے کہ لوگ اس کے خلاف مشتعل ہو جاتے۔ اگر یہ سیاست اور بیورو کریسی یا سفارت کاری میں ہوتے تو زیادہ کامیاب رہتے۔ ہم سب لوگ ان کی باتوں کو آپس میں شیئر کرتے تھے۔ ایک ہی بات کئی اشخاص کو مختلف انداز میں کہنے کی کمال مہارت رکھتے تھے۔

بحیثیت وکیل وہ زیادہ نامور اور مضبوط سمجھے جاتے تھے اور اپنے وقت کے آزاد کشمیر کے چوٹی کے وکلا میں سے نمبر ایک پر تھے۔ بحیثیت جج انھوں نے بے شمار فیصلے کیے البتہ کوئی ایسا قابل ذکر فیصلہ نہیں کیا جس سے معاشرے، معاشرت یا اداروں کی مضبوطی کے لیے مثال کے طور پیش کیا جا سکے۔ جس کیس میں کسی کی ناراض یا دل شکنی کا اندیشہ ہو، اس کی سماعت کبھی نہیں کی اور جہاں حکومت یا کسی زبان دراز کے خلاف فیصلہ ہونے کا اندیشہ پاتے تو اس کو بہت ہی خوبصورتی سے ٹال دیتے۔ اپنی چیف جسٹس شپ کے دوران ایسے جتنے کیس بھی ان کے پاس آئے، وہ ہمیشہ میرے پاس بھیج دیتے تھے۔ یا فل بنچ تشکیل دے کر فیصلہ مجھ سے لکھواتے اور خود اس سے بعد ازاں اتفاق کر لیتے۔

ان کے وقت کے دو مقدمات اپنی نوعیت کے اعتبار سے بہت اہم ہیں۔ ایک کے ذریعہ ہائی کورٹ میں تین ججوں کی بطور ایڈیشنل جج تقرری چیلنج کی گئی تھی، ان کے بنچ کے دوسرے ممبر شیر زمان چوہدری صاحب تھے۔ جن ججز کی تقریاں زیر چیلنج تھیں، ان میں ریاض اختر صاحب، محمد صدیق فاروقی صاحب اور سردار سجاول خان مرحوم تھے۔ موصوف نے فیصلہ لکھا جس میں ریاض اختر صاحب کی تقرری کو اس بنا پر درست قرار دیا کہ ان کی تقرری آزاد جموں وکشمیر کونسل کی ایڈوائس پر ہوئی ہے جبکہ آئین کے مطابق کسی بھی چیف جسٹس نے ان کو اس منصب کی تقرری کے لیے موزوں قرار نہیں دیا تھا۔ جب کہ دوسرے دو ججوں کی تقرریوں کو خلاف آئین قرار دیا لیکن رٹ اس بنا پر خارج کر دی کہ ججوں کے خلاف رٹ جاری نہیں کی جا سکتی۔ اگر ان کی تقرری خلافِ آئین ہے تو کیا وہ جج ہیں؟ اور اگر نہیں تو رٹ کس طرح جاری نہیں ہو سکتی؟ یہ فیصلہ ایک پہیلی تھا یعنی، باغباں بھی خوش رہے، راضی رہے صیاد بھی۔ اس فیصلہ کو بعد ازاں سپریم کورٹ نے کالعدم قرار دیا۔

ایک اور رٹ پٹیشن کے ذریعہ شریعت کورٹ ایکٹ اور اس[134] کے تحت تعینات کیے گئے ججز کی تقرری کو چیلنج کیا گیا۔ یہ اپنی نوعیت کا بہت حساس مقدمہ تھا کیوں کہ شریعت کے نام سے موسوم عدالت کو چیلنج کیا گیا تھا۔ موصوف نے اس مقدمے کی سماعت سے معذرت کر لی کہ وہ خود چوں کہ شریعت کورٹ کے جج ہیں اور اس میں ان کا ذاتی مفاد شامل ہے لیکن ہماری بھرپور رہنمائی کی۔ بہ ایں ہمہ اپنی خوش خلقی کی وجہ سے بغیر کوئی قابل ذکر فیصلہ کیے اپنا وقت بہت اچھے طریقے سے بغیر کسی ردوکد اور تنازع کے گزار گئے اور انتہائی باوقار طریقے سے چیف جسٹس سپریم کورٹ ریٹائرڈ ہوئے۔ اگر محمد یونس سرکھوی صاحب فوت نہ ہوتے تو خواجہ سعید صاحب کو چیف جسٹس بننے کا موقع نہیں ملنا تھا کیوں کہ انہوں نے مرحوم سے پہلے ہی ریٹائرڈ ہونا تھا۔ موصوف چار سال چیف الیکشن کمشنر آزاد کشمیر بھی رہے اور 2011 کے بدترین اسمبلی الیکشن ان ہی کی زیر نگرانی ہوئے جن میں پاکستان پیپلز پارٹی کی مبینہ مدد پر سردار عتیق خان نے ان کے خلاف نازیبا زبان بھی استعمال کی۔

23 لاکھ رشوت کا الزام

ہائی کورٹ کے جج کی حیثیت سے مجھے دو مرتبہ سپریم کورٹ میں بحیثیت ایڈہاک جج کام کرنے کا اتفاق ہوا۔ وہ اس لیے کہ وہاں چند ایک مقدمات ایسے تھے جو بقیہ ججز میں سے کوئی نہیں سن سکتا تھا جس وجہ سے کورم پورا نہیں ہوتا تھا۔ ان میں سے ایک مقدمہ جو ماسٹر سلیم نامی ایک شخص کے خلاف قتل کا تھا جس کو شریعت کورٹ نے بری کیا تھا۔ یہ مقدمہ قطعاً بریت کا نہیں تھا اور اس مقدمہ میں لاکھوں کی ڈیل کا اس زمانے میں تذکرہ ہوتا رہا تھا۔ 23 اپریل 1999 جس دن میں نے چیف جسٹس سپریم کورٹ سردار سید محمد خان صاحب مرحوم کے ہمراہ اس مقدمہ کی سماعت کی، چوہدری نور حسین مرحوم مجھے میر پور ریسٹ ہاؤس میں ملے اور اس مقدمہ میں ملزمان کے حق میں سفارش کی۔ چوہدری صاحب، بیرسٹر سلطان محمود کے والد گرامی تھے۔ ان کے ساتھ میرے وکالت کے زمانے کے تعلقات تھے لیکن یہ مقدمہ بریت کا نہیں تھا۔ فیصلہ میں نے ہی لکھا جس کے ساتھ جسٹس سید محمد مرحوم نے اتفاق کیا۔

کافی مدت کے بعد ایک روز راٹھور صاحب مرحوم میرے پاس آئے اور شکایت کی کہ میں نے 23 لاکھ روپے لینے کے باوجود ماسٹر سلیم کے خلاف کیوں فیصلہ دیا تو میں حیران رہ گیا۔ انہوں نے تفصیل بتاتے ہوئے چوہدری نور حسین کی میر پور میں میرے ساتھ ملاقات کا ذکر کیا کہ اس روز وہ یہ رقم لے کر آپ کے پاس گئے تھے۔ میں حیران و ششدر رہ گیا۔ راٹھور صاحب نے مجھے کہا کہ میں نے ماسٹر کو اسی وقت کہہ دیا تھا کہ گیلانی نہیں، یہ رقم نور حسین کھا گیا ہوگا۔ شکر ہے کہ اس مقدمے کا فیصلہ ماسٹر سلیم کے خلاف ہوا، وگرنہ کسی نے یقین نہیں کرنا تھا کہ میں نے رقم نہیں لی ہے۔

؎ نظر آتے ہیں پجاری تو بہت دولت کے!

خواجہ سعید صاحب کی چیف جسٹس شپ کے دوران ریاض اختر صاحب کی مستقل جج ہائی کورٹ تقرری کی ایڈوائس آئی تھی جس کی تصدیق سردار خالد ابراہیم صاحب نے 19 اگست 1997 کو میرے پاس کی لیکن نوٹیفکیشن اکتوبر میں جاری ہوا۔ سردار ابراہیم خان صاحب نے ایڈوائس روک رکھی اور اس عرصہ کے دوران انہوں نے جسٹس سردار نواز خان کو اور وزیر قانون جبکہ چاچا علی محمد مرحوم نے افتخار بٹ کو جج شریعت کورٹ بنوا لیا۔ یہ سارا معاملہ ایک معاہدہ کے تحت ہوا، جو ہماری سیاست کا اداروں کی قیمت پر بہت بڑا المیہ ہے۔ بالآخر ان دونوں لوگوں نے 28 اکتوبر 1998 کو بطور جج شریعت کورٹ راولاکوٹ کے مقام پر خواجہ سعید صاحب چیف جسٹس شریعت کورٹ سے حلف لیا۔

بطور جج ہائی کورٹ میرے زیر استعمال گاڑی ناقابل استعمال ہوگئی تھی لیکن افتخار بٹ سیکریٹری قانون اور چاچا علی محمد وزیر قانون کی ملی بھگت سے نئی گاڑی لینے میں ہر طرح کی رکاوٹ پیدا کی جو بالآخر سیکریٹری خزانہ فرخ قیوم نے گاڑی کے لیے رقم براہ راست اکاؤنٹنٹ جنرل آزاد کشمیر کے اکاؤنٹ میں منتقل کی جس پر ان لوگوں نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ جسٹس چوہدری محمد تاج صاحب کو جو کہ اس وقت چیئرمین پرچیز کمیٹی تھے، کو منع کیا گیا کہ گاڑی نہ خریدیں۔ ان لوگوں کی ملی بھگت کا اظہار اس وقت اور نمایاں ہوگیا جب خواجہ صاحب کے جنوری 1999 کے وسط میں عمرہ پر جانے کے بعد بطور سینئر جج میرا ایکٹنگ چیف جسٹس ہونے کا نوٹیفکیشن ان کے واپس آنے کے دو دن پہلے تک نہیں ہونے دیا

اور وہ دو دن بھی چھٹی کے تھے۔ حیرانی ہے کہ میرے بغض میں ان لوگوں[134] نے ریاستی سطح کی بددیانتی کی۔ اس پر میں نے صدر ریاست سردار محمد ابراہیم خان صاحب کو ایک احتجاجی خط لکھا جس پر انہوں نے جوابی خط میں مجھ سے معذرت طلب کی۔ یہ ان کی اعلیٰ ظرفی تھی۔

خواجہ صاحب کی سپریم کورٹ میں تقرری کے بعد بحیثیت سینئر ترین جج میری تقرری ابتدائی طور پر Acting Chief Justice کے طور پر 3 مئی 2001 اور مستقل چیف جسٹس 6 جون 2001 کو ہوئی۔ مجھے اس منصب سے محروم کرنے کے لیے کئی لابیاں سرگرم تھیں جن میں سرفہرست ریاض اختر صاحب تھے جن کی سرپرستی ایک ساتھی جج صاحب کر رہے تھے۔ بقول ریاض اختر صاحب، ان صاحب نے یہاں تک کہا تھا کہ وہ میرے حلف میں شامل نہ ہوں کیوں کہ اس طرح وہ اپنی سنیارٹی کا کیس متاثر کریں گے۔ میرا حلف اس وقت کے صدر ریاست سردار محمد ابراہیم خان صاحب نے لیا اور اس کے بعد مجھے مبارک باد دیتے ہوئے کہا کہ گیلانی صاحب، اللہ تعالیٰ نے یہ سعادت میرے مقدر میں لکھی تھی کہ آپ میرے وقت میں چیف جسٹس بنیں اور میں آپ سے حلف لوں۔ میں نے برجستہ کہا کہ سردار صاحب یہ اللہ تعالیٰ کی دین ہے جس کو چاہے سعادت عطا کرتا ہے۔

عدلیہ میں میری مدت ملازمت کے دوران سردار سید محمد مرحوم، محمد یونس سرکھوی مرحوم اور خواجہ محمد سعید چیف جسٹس سپریم کورٹ رہے۔ ججز میں سے بشارت احمد شیخ، سردار محمد اشرف جج رہے۔ ان کے علاوہ سپریم کورٹ میں چوہدری رحیم داد اور راجہ محمد خورشید خان صاحب بھی میرے جج بننے سے پہلے چیف رہے ہیں جبکہ ملک محمد اسلم مرحوم، راجہ محمد اکرم مرحوم، سردار محمد شریف مرحوم اور قاضی عبدالغفور بھی ہائی کورٹ کے جج اور سردار شریف صاحب چیف جسٹس بھی رہے ہیں۔ ان میں سے ذہانت میں بشارت احمد شیخ اور شرافت میں سید محمد، منصف مزاجی میں سردار محمد اشرف اور راجہ محمد اسلم، سخت گیری میں چوہدری رحیم داد اور سردار محمد شریف جبکہ خواجہ محمد یوسف صراف ذہانت، متانت لیکن شوخی طبع میں بھی یکتا تھے۔ مجھ سمیت آزاد کشمیر کی عدلیہ میں سب سے زیادہ ذی علم، قانون اور تاریخ پر عبور رکھنے والے شخص تھے۔ کشمیری مہاجر ہونے کی وجہ سے اکثر سیاست دانوں کے ہاں ناقابل قبول رہے۔ کشمیر کی تاریخ پر

دوجلدوں پر مشتمل کتاب بھی لکھی ہے۔ انگریزی زبان پر مکمل دسترس حاصل تھی۔ پاکستان کے قانونی جریدوں میں ان کے فیصلے آزاد کشمیر کی عدلیہ کی پہچان بنے ہیں۔ بدقسمتی سے اپنی شوخی طبع اور ذہانت کی وجہ سے زیر عتاب ہو کر نوکری سے بے گناہ نکلنے پر مجبور کیے گئے۔

کور کمانڈر راور مری کے جنرل سے ملاقات

میرے چیف جسٹس ہائی کورٹ بننے کے وقت ہائی کورٹ میں چوہدری محمد تاج اور ریاض اختر چوہدری جج تھے جبکہ شریعت کورٹ کے تین ججز افتخار حسین بٹ، سردار محمد نواز خان اور سید کلیم شاہ تھے۔ ہائی کورٹ کا چیف جسٹس ہی شریعت کورٹ کا چیف جسٹس بھی ہوتا ہے۔ میں نے چیف جسٹس بنتے ہی ہائی کورٹ کی دو خالی آسامیوں کے خلاف تقرری کی تحریک کی۔ پرانے پینل میں سے جو نام دو چیف جسٹس صاحبان کے پینل میں مشترک تھے، ان میں سے میں نے سردار محمد نواز خان، غلام مصطفی مغل اور چوہدری محمد ابراہیم ضیا پر مشتمل پینل بنا کر بھیجا۔ پنڈی کے کور کمانڈر جن کا نام غالباً عارف حسین تھا اور مری کے GoC جس کا نام غالباً وسیم تھا جو آزاد کشمیر کے معاملات میں بہت عمل دخل رکھتے تھے، نے 17 مئی 2001 کو میرے ساتھ ملاقات کی۔ اس میں احتساب کے عمل، آزاد کشمیر میں ہونے والے الیکشنز، نئی حکومت اور متوقع وزیر اعظم کے حوالے سے میری رائے بھی لی۔ اس کے علاوہ انہوں نے کہا کہ جنرل مشرف صاحب کی خواہش ہے کہ خواجہ شہاد صاحب کو ہائی کورٹ کا جج بنایا جائے۔ ان سے پہلے مری کے غالباً جنرل وسیم نامی ڈیو کمانڈر نے بھی مجھے مظفر آباد میں بریگیڈیئر یعقوب، جو بعد میں جنرل ریٹائر ہوئے، ان کے بارے میں کہا تھا۔ میں نے سیاست کے حوالے سے ان کو دیانتداری سے کہا کہ موجودہ سیاسی سیٹ اپ میں سردار عبدالقیوم خان صاحب سے بہتر کوئی آدمی نہیں ہے لیکن ان کا وزیر اعظم بننا بالواسطہ طور پر عتیق احمد خان کو بنانے کے مترادف ہے۔ اگر عملاً یہی ہونا ہے تو بہتر ہے کہ عتیق احمد خان کو ہی وزیر اعظم بننا چاہیے وگرنہ موجودہ حالات کے پس منظر میں سردار سکندر حیات سب سے اچھا انتخاب ہیں کیوں کہ وہ ٹھہراؤ والے اور قابل قبول شخص ہیں۔ جہاں تک خواجہ شہاد صاحب کا

معاملہ تھا، میں نے ان کو کہا کہ میں ذاتی طور پر ان کے جج بننے کو پسند کروں گا لیکن یہ ممکن نہیں ہے کیوں کہ چیف جسٹس سپریم کورٹ نے ان کا نام تجویز نہیں کیا ہے اور وہ کریں گے بھی نہیں کیوں کہ ان کی رائے خواجہ شہاد کے لیے مثبت نہیں۔ اس لیے فی الوقت دو چیف جسٹس صاحبان کی جانب سے جو متفقہ نام ہیں، ان میں سے ہی جج بننے چاہئیں۔ پھر انہوں نے جنرل مشرف کے ملٹری سیکریٹری جن کا نام غالباً جنرل شفاقت تھا، کے ذریعے بھی اثر انداز ہونے کی کوشش کی لیکن میں نے ان سے بھی معذرت کی۔

بطور چیف جسٹس چند اصلاحات

چیف جسٹس بننے کے بعد سب سے پہلے میں نے ماتحت عدلیہ کے جوڈیشل آفیسران کی سروس اور سنیارٹی کے تنازعات کو یکسو کیا جو گزشتہ کئی سال سے زیر التوا چلے آ رہے تھے۔ کوئی بھی چیف جسٹس کسی کی ناراضی مول لینے کو تیار نہیں تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ناراضی مول لینا بہت ہی مشکل کام ہے لیکن قانون کے مطابق انصاف کرنے میں کوئی ناراض نہیں ہوتا بلکہ تنازعات کا حل نہ کرنا یا ان کو التوا میں ڈالنا غلط فہمیوں، کدورتوں اور نفرتوں کو جنم دیتا ہے اور سرکاری ملازمین میں کام میں عدم دلچسپی اور کام چوری کا رجحان پیدا کرتا ہے۔

ایک خاتون سول جج نرگس شاہین جن کی تقرری ابتدائی طور پر ایڈہاک بنیادوں پر ہوئی تھی اور کئی سال بعد قانون کے مطابق مستقل تقرری ہوئی۔ موصوفہ نے محکمہ میں اپنے سے بہت سینئر لوگوں کے خلاف اس بنا پر عرضداشت داغ دی کہ وہ چوں کہ ان سے پہلے ایڈہاک بنیادوں پر تعینات ہوئی تھیں، اس لیے اس عرصہ کو شمار کر کے وہ ان سے سینئر ہیں۔ یہ بالکل واضح معاملہ تھا جس میں کوئی ابہام نہیں تھا لیکن اس خاتون جج کی بے لگامی کی وجہ سے کسی نے اس کی عرضداشت پر فیصلہ نہیں دیا۔ اسی بنیاد پر دیگر جوڈیشل آفیسران نے بھی اسی طرح کے حیلے بہانوں پر مبنی عرضداشتیں ایک دوسرے کے خلاف دائر کی تھیں جو کہ تقریباً 12 یا 13 تھیں۔ اس وجہ سے برس ہا برس سے کئی لوگوں کی ترقیاں رک گئی تھیں۔ میں نے سب سے پہلے یہ معاملہ یکسو کر کے اس کا فیصلہ کیا اور اس کے بعد ان لوگوں کی

سنیارٹی لسٹ مرتب کر کے سلیکشن بورڈ کے ذریعہ ہر شخص کو اس کے استحقاق کے مطابق ترقیاب کیا۔ کچھ لوگوں کی ترقیابیاں ان کی ناقص کارکردگی کی بنا پر روک دیں۔ جن لوگوں کی شہرت اچھی نہیں تھی اپنے چیمبر میں بلا کر سمجھایا کہ وہ خود ریٹائرمنٹ لے لیں وگرنہ مجھے ان کے خلاف کارروائی کرنا پڑے گی۔ اس طرح میں نے اس سسٹم کو پٹڑی پر چڑھانے کی حتی الامکان کوشش کی اور ہر شخص کو اس کا حق اس وقت سے دیا جس وقت سے یہ due ہوا تھا۔ ماتحت جوڈیشری میں پہلی مرتبہ گریڈ 21 میں سیشن جج کو ترقیاب کیا گیا اور میرے عرصہ تعیناتی کے دوران کوئی بھی جوڈیشل آفیسر ایسا نہیں تھا جس کی کم از کم ایک بالا گریڈ میں اور کئی لوگوں کی دو یا تین بالا گریڈز میں ترقی نہ ہوئی ہو۔ اگر سنیارٹی کے تنازعات کا فیصلہ نہ کیا گیا ہوتا تو کم از کم چار جوڈیشل آفیسر تیس سال کی سروس کے باوجود بھی گریڈ 18 میں ہی ریٹائر ہو گئے ہوتے جبکہ ان میں کم از کم تین گریڈ 21 میں ریٹائر ہوئے جو سروس کیڈر میں سب سے بڑا گریڈ ہے۔

نظام انصاف ریاست کے اداروں میں کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ جس ملک میں سیاسی اور انتظامی سطح پر انصاف نہ ہو، وہاں لوگوں کی امیدیں عدالتوں سے وابستہ ہوتی ہیں۔ پاکستان جس کا آزاد کشمیر بھی ایک حصہ ہے، میں شروع سے ہی سیاسی اور ادارتی عدم استحکام رہا ہے۔ ریاستی ادارے ہمیشہ سیاست کی بھینٹ چڑھے ہوتے ہیں اور ہر حکومت کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ اپنے ورکرز کو سروس سٹرکچر کے ہر شعبہ میں کھپائے اس کا اثر عدلیہ پر بھی پڑا ہے۔ بہ ایں ہمہ ریاست کے دیگر اداروں کے مقابلے میں عدلیہ پر لوگوں کا اعتماد ابھی تک متزلزل نہیں ہوا ہے۔ میری کوشش رہی کہ لوگوں کو ان کے گھروں کے قریب عدالتوں کی سہولت میسر رہے تا کہ انتظامی بدمعاملگی اور چھوٹے موٹے تنازعات جو کہ عدالتوں میں آنے ہوں لوگوں کو کم سے کم مسافت اور خرچ پر ان کے گھر کے قریب یکسو کرنے کا موقع ملے۔

آزاد کشمیر میں ایک روایت چلی آ رہی ہے کہ یہاں تقریباً ہر ضلعی ہیڈ کوارٹر پر ہائی کورٹ tour رکھ کر وہاں اس علاقے سے متعلق مقدمات کی سماعت ہوتی ہے اس کی ترویج اس طرح ہوئی کہ جس علاقے سے تعلق رکھنے والا چیف جسٹس ہوا کرتا تھا، اس نے اس علاقے کے قریب تر ہائی کورٹ کا

سرکٹ بنچ قائم کر دیا۔ سردار محمد شریف صاحب جب چیف جسٹس بنے تو ان کا زور راولاکوٹ کی جانب رہا جبکہ صراف صاحب کا میرپور کی جانب۔ چوہدری رحیم داد صاحب نے کوٹلی میں اس کا قیام کروایا اور اس کے بعد یہ ایک مستقل فیچر بن گیا کہ ان ہی جگہوں پر ہائی کورٹ tour کرتی ہے۔ یہ ایک سیاسی نوعیت کا معاملہ بن گیا تھا جس کو میں پسند نہیں کرتا تھا لیکن میں اس کو واپس کرنے کی پوزیشن میں بھی نہیں تھا، اس لیے میں نے کوشش کی کہ ہر ایک سرکٹ پر روٹیشن میں کم از کم ایک جج ہمہ وقتی رہے اور ہیڈ کوارٹر میں تین جج یا کم از کم دو جج رہنے چاہئیں۔ چوں کہ شریعت کورٹ کا علیحدہ قیام ہو گیا تھا جس کو فوجداری کے اکثر معاملات بشمول قتل کیسز کی سماعت کا اختیار ہے، اس لیے میرے عرصہ چیف جسٹس شپ کے دوران کوئی بھی سٹیشن ایسا نہیں تھا جہاں ہر وقت ہائی کورٹ یا شریعت کورٹ کا ایک جج موجود نہ رہا ہو۔ اس وجہ سے مقدمات کے التوا کی بدعت کافی حد تک کنٹرول ہو گئی اور ہر سٹیشن سے مقدمات کے فیصلے بالخصوص پرانے مقدمات کے فیصلے ہونے شروع ہو گئے۔ اس طرح وکلا اور عوام کو بہت سہولت ملی اور ادارے میں استحکام آ گیا۔

ایڈیشنل سیشن جج کی عدالت ہر سب ڈویژن لیول پر قائم کی گئی اور اس علاقے سے متعلق سارے معاملات سب ڈویژن لیول پر چلے گئے۔ اس طرح ضلعی صدر مقام پر مقدمات کی بھرمار ختم ہو گئی اور لوگوں کو ان کے گھروں کے قریب ہی معاملات یکسو کرنے کا موقع ملا۔ فیملی معاملات کے مقدمات کی سماعت کا اختیار صرف فیملی ججز کو ہوتا تھا جو ضلعی صدر مقامات پر بیٹھتے تھے اس سے لوگوں کو بالخصوص خواتین کو بہت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ یہ اختیارات نہ صرف سب ڈویژن لیول پر ایڈیشنل سیشن ججز کو دیئے گئے بلکہ جس سول جج کی سروس پانچ سال سے زیادہ تھی، اس کو بھی ان مقدمات کی سماعت کے لیے قانون سازی کروائی گئی۔

ماضی میں حکومت کی تحریک پر ایسے سارے مقدمات، جن میں حکومت فریق ہوتی کے لیے لازمی قرار دیا گیا تھا کہ ان کی سماعت صرف ضلعی ہیڈ کوارٹر پر ہوا کرے گی۔ اس کو ختم کر کے مقامی عدالت جہاں بنائے دعوی پیدا ہو، کو سماعت مقدمہ کرنے کا حکم دیا اور یہی منشائے قانون بھی تھی۔ اس

سے حکومتی بیوروکریسی کو بڑی جزبز ہوئی لیکن عوام کی سہولت کو ہر چیز پر تقدم حاصل ہے۔ سیشن ججز کو کسی زمانے میں سوزوکی گاڑیاں دی گئی تھیں جو پندرہ سال پرانی ہو کر ناقابل رفتار ہو گئی تھیں اور یہ پوری عدلیہ کے لیے مذاق بن گیا تھا۔ ان لوگوں کو نئی ٹیوٹا گاڑیاں مہیا کروائیں۔ جسٹس ریاض اختر صاحب نے اعتراض بھی کیا کہ اس طرح سیشن جج اور ہائی کورٹ کے ججوں میں کوئی فرق نہیں رہے گا یعنی کوئی پہچان نہیں سکے گا کہ یہ سیشن جج کی گاڑی ہے یا ہائی کورٹ کے جج کی۔ میں نے ان کو سمجھایا کہ فرائض منصبی کے اعتبار سے ان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ البتہ حفظ مراتب کے لحاظ سے فرق ہے اس لیے اگر وہ لوگ بھی اسی قدر معزز نظر آئیں اور سہولت کا استفادہ کریں تو اس سے ہماری عزت میں اضافہ اور کام کاج میں سہولت میسر ہوگی۔ اس طرح پہلی مرتبہ ایڈیشنل سیشن ججز کو بھی گاڑیاں مہیا کروائیں۔

وکلاء عدالتی نظام کا جز ہے جن کی پروقار پر مغز کارکردگی پر انصاف کا انحصار ہے۔ میں نے وکلاء کے لیے عدالتی حاضری کے دوران وردی کے اہتمام کو لازمی قرار دیا تا کہ یہ عام لوگوں سے نمایاں نظر آئیں۔ عدالت العالیہ میں پلیڈنگس انگریز میں پیش کرنا اور بحث بھی انگریزی میں کرنے کی نہ صرف حوصلہ افزائی کی بلکہ لازمی بھی قرار دیا کیوں کہ ہماری قانون کی کتابیں اور رپورٹڈ فیصلے بھی انگریزی میں چھپے ہیں۔ سیشن ججز کو آئین کا مطالعہ کرنا لازمی قرار دیا۔

تحصیل اور ضلع قاضی

آزاد کشمیر کا نظام عدل سردار عبدالقیوم خان صاحب نے دو ممبری کورٹ بنا کر بہت گنجلک بنا دیا ہے۔ ابتدائی سطح پر تحصیل فوجداری عدالت تحصیل قاضی اور سول جج جبکہ سیشن لیول پر سیشن جج اور ضلع قاضی پر مشتمل ضلعی فوجداری عدالت بنائی ہے جو بے ہنگم سسٹم ہے۔ یہ لوگ صرف فوجداری مقدمات سنتے ہیں۔ سول جج ہائی کورٹ کے جبکہ قاضی اب شریعت کورٹ کے ماتحت ہیں، پہلے محکمہ امور دینی کے ماتحت ہوتے تھے۔ میں بسیار کوشش کے باوجود اس کی اصلاح نہیں کروا سکا، جس پر میں نے اسی کی سمت درست کرنے کی کوشش کی۔

میری خواہش تھی کہ تحصیل اور ضلع قاضیوں کا ان کے ہم پلہ ججز کے ساتھ باہم تبادلہ ہو سکے جس کے لیے میں نے قانون سازی کی تجویز دی تھی لیکن قاضی صاحبان کے خلاف ہر کس و ناکس کے تحفظات ہیں۔ ان کے خلاف مولویوں کے خوف کی وجہ سے بول بھی نہیں سکتے لیکن ان کو سول ججز کے ہم پلہ دیکھنا بھی نہیں چاہتے۔ اس میں کسی حد تک قاضی صاحبان کا اپنا طرزِ عمل بھی ذمہ دار ہے کیوں کہ ان میں سے کچھ لوگ اپنے آپ کو کسی ڈسپلن کا پابند نہیں سمجھتے۔ جلسے جلوسوں' فرقہ ورانہ سرگرمیوں اور حکومت کے اہلکاروں کے ساتھ مکس اپ ہونے کی وجہ سے لوگ ان پر اعتماد نہیں کرتے۔ شروع شروع میں تو حکمران جماعت سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو ہی قاضی مقرر کیا گیا جو اپنے آپ کو حکومتی جماعت کا فرد سمجھتے تھے اور ان کے احکامات کے مطابق چلتے تھے۔ ان لوگوں کی تقرری کا مقصد بھی غالباً یہی تھا۔ سردار عبدالقیوم صاحب چوں کہ کسی کالج یا یونیورسٹی سے فارغ التحصیل نہیں تھے، گو کہ خود بہت ہی کثیر المطالعہ اور یونیورسٹی کے کسی بھی فارغ التحصیل سے زیادہ علم رکھتے تھے، لیکن اس پس منظر میں اپنی سیاسی گرفت کے لیے اپنے مصاحبین کو پڑھے لکھے ججز کے ہم پلہ بنا کر اپنی برتری ظاہر کرنے کی کوشش کی۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس ادارے نے کافی ترقی کی اور اب میں بلاخوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد اور سعودی عرب کی جامعات کے فارغ التحصیل، ہر لیول کا قاضی اپنے ہم پلہ ججز بلکہ ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے کئی ججز سے زیادہ لائق اور ذہین ہیں۔ ان کی تقرری کے عمل نے بھی اچھے لوگوں کو آگے آنے کا موقع دیا ہے۔ اور اب وقت آ گیا ہے کہ ان کو سٹریم لائن کیا جائے، یک ممبری کورٹ بنا کر ان کو اور اپنے ہم پلہ ججز سے ٹرانسفر ایبل بنایا جائے اور ان لوگوں کو ہی شریعت کورٹ میں تقرری کا اہل قرار دینے کے لیے قانون سازی کی جائے۔ تحصیل قاضیوں کو اس عرصہ کے دوران مجسٹریٹ کے اختیارات بھی تفویض کیے گئے جو کامیاب تجربہ ثابت ہوا۔

ہائی کورٹ میں ججوں کی تقرری

میرے چیف جسٹس بننے کے بعد کافی عرصہ تک ججوں کی دو آسامیاں خالی رہیں، جن کے

لیے انتظامیہ کو بار بار تحریک کرنے کے باوجود تقرریاں نہ ہوئیں۔ ہائی کورٹ میں میرے علاوہ صرف دو ہی جج تھے جو بھی آپس میں باہم دست و گریبان تھے۔ اس عرصہ کے دوران ہائی کورٹ میں احتساب کے قانون کے تحت ایک مقدمہ زیر سماعت آیا جس کی سماعت کم از کم دو ججز نے کرنی تھی۔ دو ججز میں سے ایک نے مقدمہ کی سماعت سے معذرت کی جبکہ دوسرے جج نے کسی عذر کی بنا پر بنچ میں بیٹھنے سے انکار کر دیا۔ میرے خیال میں احتساب کے غلغلے کے خوف سے دونوں ججز نے اپنی جان چھڑائی تھی۔ بہرحال میں نے عدالتی حکم میں لکھا کہ ''چوں کہ قانون کے تحت اس مقدمہ کی سماعت دو ججز نے کرنی ہے جبکہ درج بالا وجوہات کی بنا پر بنچ مکمل نہیں ہوسکتا۔ ایک جانب قانونی تقاضے ہیں اور دوسری جانب انسانی حقوق کا سوال ہے، کیوں کہ جن لوگوں کا معاملہ ہے، وہ زیر حراست ہیں، اس لیے اگر دو ہفتے کے اندر اندر خالی آسامیوں کے خلاف تقرری بھیجے گئے پینل میں سے نہیں ہوتی تو میں یہ باور کرنے پر مجبور ہو جاؤں گا کہ احتساب کے قانون کا وہ حصہ جو دو ججز پر مشتمل کورٹ کا ہونا لازمی قرار دیتا ہے، بے اثر اور ناقابل نفاذ سمجھا جائے گا۔ اس لیے ایک جج پر مشتمل عدالت مقدمہ کی سماعت کرے گی۔'' اس حکم کی ایک نقل کشمیر کونسل اور صدر کے سیکریٹری کو بھی بھیج دی۔ اس طرح ججز کی تقرری کا معاملہ ایک ہفتہ کے اندر اندر ہی حل ہو گیا اور سردار محمد نواز خان اور غلام مصطفیٰ مغل کی تقرریاں عمل میں آئیں۔ ان لوگوں کی تقرری کے لیے میری سفارشات صدر پاکستان جنرل مشرف جو اس وقت کشمیر کونسل کے چیئرمین بھی تھے، کے پاس پہنچیں۔ صدر مشرف کے ملٹری سیکریٹری جن کا نام غالباً شفاقت حسین تھا، نے مجھے فون کر کے کہا کہ آپ نے دو اسامیوں کے لیے صرف تین نام بھیجے ہیں جبکہ چھے ہونے چاہیے تھے۔ میں نے ان کو جواب دیا کہ اس وقت میرے نزدیک آزاد کشمیر بھر میں صرف یہی لوگ اس کے قانونی اور اخلاقی معیار پر پورا اترتے ہیں۔ مرکزی سطح پر فوجیوں اور مقامی سطح پر مقامی لیڈروں کی ترجیحات بھی مجھ تک پہنچائی گئیں لیکن ان میں سے کسی کو بھی اثر انداز نہیں ہونے دیا۔ ابراہیم ضیا بعد ازاں پہلے سپریم کورٹ کے ایڈہاک جج پھر مستقل جج مقرر ہو کر چیف جسٹس کے عہدے پر فائز ہوئے جبکہ سردار نواز خان اور غلام مصطفیٰ مغل ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کے طور بلا شبہ کامیاب ترین رہے۔ غلام مصطفیٰ مغل نے ماتحت عدلیہ میں وسیع تر

اصلاحات اور تقرریاں کیں۔ مجھے ان سب کی کارکردگی پر اطمینان اور فخر ہے۔ 134

وزیر اعظم سکندر حیات کی بیان بازی

چیف جسٹس کے طور میرے عرصہ تعیناتی کے دوران سردار سکندر حیات خان کی حکومت تھی۔ میں نے ان کے ساتھ مشاورت کر کے یہ طے کیا تھا کہ فیملی ججز کے اختیارات پانچ سال سے زائد سروس کے حامل سول ججز کو دے کر تمام فیملی ججز کو تابع استحقاق ایڈیشنل سیشن جج بنا کر سب ڈویژن لیول پر تعینات کیا جائے گا۔ لیکن انہوں نے تحریری طور پر اتفاق کرنے کے باوجود مختلف بار ایسوسی ایشنز میں جا کر تقریر بازی شروع کر دی کہ چیف جسٹس ضلعی صدر مقام کی حیثیت ختم کر کے بار کو تقسیم کرنا چاہتا ہے۔ مجھے اس بات کا بہت دکھ ہوا کہ ریاست کا وزیر اعظم اس قدر غیر ذمہ داری کا مظاہرہ کر رہا ہے کہ خود تحریری طور پر اتفاق کر کے یہ کچھ کہہ رہے ہیں جس پر ان کی تحریر کی فوٹو کاپیاں بار ایسوسی ایشنز کو بھجوا کر ان کو عیاں کیا۔

سیاست دان موقع محل، لوگوں کے موڈ اور اپنے ذاتی مفاد کے مطابق بات کرتے ہیں، اصول اور ادارے جہنم میں جائیں۔ اس لحاظ سے ان کا کوئی دین دھرم اور اخلاقی معیار نہیں ہوتا۔ ان کو میرے خلاف دراصل کچھ تحفظات تھے۔ ایک تو یہ کہ وہ مجھے اور میری فیملی یعنی میرے بھائیوں کے سردار عبدالقیوم صاحب اور ان کی فیملی کے لوگوں کے ساتھ تعلقات کی وجہ سے ان کے قریب اور اپنا مخالف سمجھتے تھے جو کہ بالکل غلط ہے۔ میرا اپنے کام سے کام تھا اور میں نے کسی سیاست دان کی کبھی طرفداری نہیں کی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے داماد چوہدری محمد رشید جو سیشن جج تھے، کی تعیناتی بطور سیشن جج میر پور چاہتے تھے جو میں نے نہیں کی۔ انہوں نے اس سلسلے میں میرے پاس اس وقت کے وزیر قانون راجہ نثار خان کے علاوہ اپنے قریبی ساتھیوں ممتاز گیلانی مرحوم جو کہ اس وقت سینئر وزیر تھے، کو بھی بھیجا، لیکن میں نے اس اصول کے تحت ایسا نہیں کیا کہ میں اپنے علاقے میں سیشن ججز کی تقرری کے خلاف ہوں۔ اس طرح لوگ مقامی خاندان اور سیاسی اثر و رسوخ میں آ جاتے ہیں اور اپنی

پسند اور ناپسند کی وجہ سے ادارے کی کارکردگی پر اثر انداز ہو جاتے ہیں۔

سکندر حیات صاحب گو کہ انتظامی طور بہت اچھے بلکہ شاید سب سے اچھے وزیر اعظم گزرے ہیں، لیکن انتقامی طور پر بھی ان کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ انہوں نے میری اصول پسندی کو سراہنے کی بجائے میرے بھائیوں سے انتقام لیا جو سول سروس میں تھے۔ ایک ڈپٹی کمشنر کیڈر میں تھا لیکن اس کو کسی ضلع میں ڈپٹی کمشنر نہیں لگایا جبکہ اس سے جونیئر لوگوں کو لگائے رکھا اور دوسرے کو جو سیکریٹری کیڈر میں تھا کو کسی محکمے کا سیکریٹری نہیں ہونے دیا جبکہ اس سے کم تعلیمی اہلیت کے حامل اور جونیئر لوگوں کو مختلف محکمہ جات کا سیکریٹری لگایا۔ ایک مرتبہ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ میں ظہور (میرے بھائی) کو ڈی سی لگانا چاہتا ہوں، آپ کی کیا خواہش ہے؟ کہاں لگاؤں؟ میں نے ان کو جواب دیا کہ وہ آپ کا ملازم ہے، آپ اس سے جہاں کام لینا پسند کرتے ہیں، وہاں لگائیں۔ پھر انہوں نے خود کہا کہ میں اس کو اپنے ضلع کوٹلی میں لگانا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا کہ آپ کی مرضی ہے۔ بہرحال انہوں نے ایسا نہیں کیا۔

مجھے اس بات کا احساس تھا کہ میری وجہ سے میرے بھائیوں کی مناسب پوسٹنگ نہیں ہو رہی ہے، لیکن میں نے کبھی وزیر اعظم کو اس کا احساس بھی نہیں ہونے دیا حتیٰ کہ اپنے سخت گیر اصول کے برخلاف میں نے ان کے داماد چوہدری عبدالرشید کے سنگین جرم کو نظر انداز کیا اور مجھے اپنے سینے پر پتھر رکھ کر اس کو برداشت کرنا پڑا کہ کسی کو یہ گمان نہ گزرے کہ میں کوئی انتقامی کارروائی کر رہا ہوں۔ موصوف نے محکمہ کے کاغذات میں اپنی تاریخ پیدائش چھے سال کم لکھوا کر میٹرک کا جعلی سرٹیفکیٹ جمع کرایا تھا۔ جب اس کی میرے پاس شکایت ہوئی تو میں نے لاہور بورڈ سے اس کی تصدیق کرائی جس نے تحریری طور پر یہ تصدیق جاری کی کہ پیش کردہ سرٹیفکیٹ ان کا جاری کردہ نہیں ہے۔ وہ آج بھی میرے کاغذات میں موجود ہے۔

اسی طرح کا ایک سرٹیفکیٹ ریاض اختر صاحب نے آزاد کشمیر کے ایک معروف اور چوٹی کے وکیل کی نسبت کراچی یونیورسٹی سے منگوایا جس میں ان کی قانون کی ڈگری کو جعلی قرار دیا گیا تھا۔ ریاض صاحب نے اس کے خلاف کارروائی اور اس کا لائسنس منسوخ کرنے کو کہا لیکن میں نے یہ کہہ کر

انکار کر دیا کہ اس وکیل کی اہلیت اس کی ڈگری سے زیادہ ہے جس سے ہم محروم ہو جائیں گے۔ اس لیے میں اس گناہ کو اپنے سر لیتا ہوں۔ اس کو چلنے دیں۔ البتہ اس نقص کی وجہ سے کوئی بھی وکیل مضبوط موقف پر بھی قائم نہیں رہ سکتا کیوں کہ باقی وکلاء اس بات کو ایکسپلائیٹ کر کے اس کو دبا دیتے ہیں۔ ہر حکومت اپنی قانونی ٹیم میں ان کو نمایاں حیثیت دیتی ہے کیوں کہ یہ حکومت کی خواہش کے مطابق مشورہ دیتے ہیں۔ میں انہیں شریف الدین پیرزادہ کے ہم پلہ سمجھ کر پیرزادہ صاحب کہتا ہوں۔ میرے بعد آنے والے چیف جسٹس نے مجھ سے یہ سرٹیفکیٹ مانگے لیکن میں نے ان کو دینے سے اس لیے انکار کر دیا کہ اس کی بنا پر وہ ان لوگوں کو بلیک میل کریں گے۔

بحیثیت چیف جسٹس میں نے حکومت کو تجویز کیا تھا کہ آزاد کشمیر کی اعلیٰ عدلیہ کے مالی معاملات کشمیر کونسل کے سپرد کر دیں اور سپریم کورٹ آزاد کشمیر کو وہ اختیار دیں جو سپریم کورٹ پاکستان کو حاصل ہیں۔ دونوں کو سکندر صاحب نے یہ کہہ کر بلا کسی تحریر کے داخل دفتر کر دیا کہ یہ جج پہلے ہی نہیں مانتے جب ان کے مالی معاملات بھی ہم سے نکل گئے اور زیادہ اختیارات بھی مل گئے تو فرعون بن جائیں گے۔

زبیر بٹ اور جعلی کور کمانڈر

بطور چیف جسٹس میرے ساتھ ایک روز ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ میں اپنے چیمبر میں بیٹھا تھا میرے پاس احتساب بیورو کے چیف پروسیکیوٹر سردار عاشق محمود خان سدوزئی بھی بیٹھے تھے۔ میرے پرائیویٹ سیکریٹری طارق قریشی نے مجھے کہا کہ کور کمانڈر راولپنڈی میرے ساتھ بات کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ کرواؤ۔ موصوف نے میرے ساتھ دو روز قبل محکمہ میں ہونے والے تبادلہ جات کی بات کی اور کہا کہ آپ نے پسند اور ناپسند کی بنیاد پر یہ تبادلے کیے ہیں اور زبیر بٹ نامی ایک شخص کو انتقام کا نشانہ بنایا ہے۔ اس نے بات کافی طویل کی اور اس ساری گفتگو کا مرکزی نقطہ یہی تھا۔ مجھے گمان گزرا کہ ایسی غیر معقول گفتگو کسی جنرل کی نہیں ہو سکتی۔ ہو نہ ہو کہیں اسی جج نے یہ ٹیلیفون کیا یا

کروایا ہو۔

چنانچہ میں نے اس مہینے کے سارے ججز کے دفتر اور گھر کے بل منگوا لیے۔ میں نے ایکسچینج سے اس دن کی کالز کی نسبت معلومات حاصل کیں کہ کہاں کہاں سے میرے نمبر پر کالز آئی تھیں۔ پتا چلا کہ یہ کال اسی جج کے گھر کے سرکاری فون سے کی گئی تھی۔ چنانچہ میں نے اس مہینے کے سارے ججز کے گھر کے بل منگوا کر، اس بل کو دفتر میں روک کر اس واقعہ کے بارہ میں ایک انکوائری کمیٹی بنائی جو تین جوڈیشل افسروں پر مشتمل تھی۔ کمیٹی نے پوری تحقیقات کر کے رپورٹ کی کہ یہ کال زبیر بٹ کے سرکاری نمبر سے اس روز ہوئی تھی اور وہ فی الواقعہ اس دن دفتر سے اس وقت گھر چلا گیا تھا کیوں کہ اس روز کوٹلی بار کے انتخابات تھے اور وکلا ادھر مصروف تھے جس وجہ سے جوڈیشل آفیسران اپنے گھروں کو چلے گئے تھے۔

گو اس معاملہ میں بحیثیت چیف جسٹس حاکم مجاز میں ہی تھا لیکن میری یہ پریکٹس تھی کہ میں تمام معاملات باقی دوستوں کی مشاورت سے چلاتا تھا، اس لیے میں نے ان سے مشورہ کر کے اس جج کی برطرفی کا حکم دے دیا۔ یہ جج ہماری شریعت کورٹ کے جج افتخار حسین بٹ کے کزن اور برادر نسبتی بھی تھے جن کے ساتھ میرے گھریلو تعلقات بھی تھے۔ وہ خود ان دنوں وزیراعظم سیکریٹریٹ میں تعینات تھے جو کوٹلی کے ایک دولت منداور بااثر خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے خاندان پر مشتمل خواتین سے بھری ایک گاڑی میرے گھر بھی اسی سلسلہ میں آئی۔ لیکن معاملہ میری ذات کا نہیں بلکہ ایک جوڈیشل آفیسر کی اپنے ادارے اور اپنے چیف جسٹس کے ساتھ انتہائی نازیبا اور پیشہ ورانہ بدمعاملگی کا تھا، اس لیے اس میں مصلحت یا مصالحت کی کوئی گنجائش نہیں تھی اور میں اس پر یقین بھی نہیں رکھتا۔ ان لوگوں کے سردار سکندر حیات خان کے ساتھ بہت قریبی تعلقات تھے اور کوٹلی ان کے علاقہ سے بھی تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے بطور وزیراعظم، ان سے میرا حکم منسوخ کروا دیا۔ یہ حکم بھی میں نے ججز کی میٹنگ میں رکھا۔ سب نے اتفاقِ رائے سے اسے کالعدم قرار دے کر اس کو عدالتی معاملات میں مداخلت اور عدالتی آزادی پر وار قرار دیا۔ سکندر حیات خان کے بطور وزیراعظم اس حرکت کو کسی نے

قبول نہیں کیا اور ہمارے طرزِ عمل کی وجہ سے اس کی بہت سبکی ہوئی۔ دوبارہ کسی حکومت نے عدلیہ کے معاملات میں مداخلت نہیں کی لیکن ججوں کی ذاتی کمزوریوں سے بھرپور فائدہ اٹھاتے رہے۔

کرنل سے ملاقات کا ٹی اے بل

اس زمانے میں آئی ایس آئی اور ایم آئی سول انتظامی مشینری پر غالب تھے۔ ہمارے ایک سیشن جج نے تین ہزار روپے TA/DA کا بل بھیجا کہ وہ میرپور سے مظفرآباد ایم آئی کے کرنل کے ساتھ میٹنگ کے لیے آئے ہوئے تھے۔ جب میں نے اس پر اعتراض کر کے سیشن جج کے خلاف کارروائی شروع کی تو کرنل نے درخواست کی کہ اس کا حوالہ کیس میں نہ آئے اور کہا کہ اس نے بالکل نہیں بلایا تھا۔ بعدازاں معلوم ہوا کہ یہ سیشن جج جس کو اس کے ساتھی سائیں کہتے تھے اور اصل نام چوہدری بشیر تھا، اسی کرنل کے پاس یہ سفارش کرانے گیا تھا کہ اس کو ہائی کورٹ کے جج کے لیے زیرغور لایا جائے۔ اس کے خلاف جب میں نے تادیبی کارروائی شروع کی تو اس کرنل نے اس کو ڈراپ کرانے کی حتی المقدور کوشش کی لیکن میں نے اس سیشن جج کی تین سال کے لیے تنخواہ میں اضافہ پر پابندی عائد کر دی۔ برطرف اس لیے نہیں کیا کہ چند ماہ بعد اس نے ریٹائر ہونا تھا۔

بلڈنگز میں توسیع

میں نے بطور چیف جسٹس مظفرآباد، میرپور اور راولاکوٹ میں ہائی کورٹس کی بلڈنگز کی توسیع و تعمیر کے لیے تجاویز بھیجی تھیں جن میں سے مظفرآباد کی بلڈنگ کی توسیع کے لیے کام مکمل ہو کر اس میں چار کورٹ رومز کا اضافہ ہوا، جبکہ اس سے پہلے بھی یہاں چار کورٹ رومز تھے جو شریعت کورٹ کے ججوں کی تعداد کی وجہ سے کم تھے۔ میرپور کے مقام پر میری تجویز تھی کہ موجودہ ہائی کورٹ کی بلڈنگ کے ساتھ تحصیلدار کا دفتر اور اس سے ملحقہ ایریا پر ہائی کورٹ کی بلڈنگ اور ججوں کے لیے جوڈیشل لاج اور راولاکوٹ میں سول دفاتر کے عقب میں موجود جگہ پر ہائی کورٹ کی بلڈنگ تعمیر کی جائے۔ راولاکوٹ

میں اب یہ منصوبہ مکمل ہو گیا ہے۔ پلندری کے مقام پر سول دفاتر کے قیام کے ساتھ ساتھ میں نے سول کورٹس کی تعمیر کی بنیاد رکھ دی تھی جو اب مکمل ہو کر ڈسٹرکٹ کورٹس اس میں منتقل ہو چکے ہیں۔ زلزلے کے بعد اب مظفر آباد کے مقام پر ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کی بلڈنگز کی ازسرنو تعمیر کی گئی ہے۔

پاکستانی عدلیہ سے وابستگی

بحیثیت چیف جسٹس مجھے سپریم کورٹ پاکستان اور صوبوں کے چیف جسٹس سے تعلقات بنانے کا موقع ملا۔ بطور جج میرے چیف جسٹس پاکستان سجاد علی شاہ سے تعلقات تھے جس کے ذریعہ پہلی بار خواجہ محمد سعید چیف جسٹس ہائی کورٹ کو پاکستان کی چیف جسٹس کمیٹی کا ممبر بنوایا۔ میں نے پاکستان جوڈیشل اکیڈیمی اور شریعہ کورس کے لیے آزاد کشمیر کی ماتحت عدلیہ کی ٹریننگ کا بھی اہتمام کروایا۔ بیرون ملک کانفرنسز میں جانے کے لیے عدلیہ کی راہ ہموار کی۔ سرکاری پاسپورٹ اور VIP لاؤنج کے کارڈ حاصل کروائے۔ پاکستان میں کانفرنسز میں آزاد کشمیر عدلیہ کا راستہ ہموار کروایا۔

سول کورٹس کا قیام

حکومت نے اس عرصے میں دو نئی سول کورٹس کے قیام کی منظوری دے کر ان میں سے ایک مظفر آباد میں ڈنہ کے مقام پر اور دوسری راولاکوٹ میں پانیولہ کے مقام پر قائم کرنے کا نوٹیفکیشن جاری کیا۔ ہم لوگوں نے اس سے اتفاق نہیں کیا۔ ہمارا موقف تھا کہ آسامیاں تخلیق کرنا حکومت کی ذمہ داری اور اختیار میں تو ضرور ہے، لیکن یہ کس جگہ ہونی چاہئیں، اس کا تعین کرنا ہائی کورٹ کا کام ہے۔ لیکن حکومت کے دو وزیروں کی خواہش تھی کہ کورٹس کا قیام ان دو جگہوں پر ہی ہونا چاہیے۔ بہرحال ہم نے اس سے اتفاق نہیں کیا کیوں کہ یہ جگہیں عدالت قائم کرنے کے لیے کسی طور موزوں نہیں تھیں۔ اس کے برعکس ہم نے تجویز دی کہ آزاد کشمیر کے ہر تھانہ کی سطح پر ایک سول کورٹ قائم ہونی چاہیے تو اس صورت میں ان دو جگہوں پر بھی اتفاق کیا جا سکتا ہے، وگرنہ صرف دو جگہوں کے لیے ایک محدود سے ایریا کے تھانہ کی حدود تک محیط عدالت کا قیام بلاضرورت اور بے تکا عمل ہے۔

میں نے وزیر اعظم سکندر حیات خان کے ساتھ میٹنگ میں ان کو بتایا کہ اس میں اصولی فیصلہ کریں کہ یا تو یہ تھانہ کی سطح پر سول کورٹ ہونی چاہیے یا ضلعی صدر مقام پر سول ججز کی تعداد میں اضافہ کیا جائے۔ وگرنہ ڈنہ اور پانیولہ میں کورٹس کا قیام انتظامی بدعملی ہوگی۔ انہوں نے تو کچھ نہیں کیا کیوں کہ وہ مقامی اسمبلی ممبرز کے دباؤ میں تھے البتہ ہم نے ان عدالتوں کو مظفر آباد اور راولاکوٹ کے ضلعی ہیڈکوارٹرز پر قائم کیا۔ اور ان علاقوں کا کام بالخصوص ان عدالتوں کو تفویض کیا۔

جج کے فکر کی چھاپ

بحیثیت جج ہائی کورٹ اور چیف جسٹس مجھے اپنے وقت کے انتہائی حساس اور پیچیدہ آئینی اور سیاسی نوعیت کے مقدمات کا فیصلہ کرنے کا اتفاق ہوا۔ ان میں سے کچھ تو میں نے واحد جج کی حیثیت سے کیے اور کچھ لارجر بنچ کے ممبر اور سربراہ کی حیثیت سے لیکن ان سب کو لکھنے کا اعزاز مجھے حاصل رہا۔ اعلیٰ عدلیہ کے جج معروف ملازمت کے اصولوں کے مطابق باقی بیوروکریسی کی طرز کے ملازم نہیں ہوتے اور نہ ہی ان کو اپنے آپ کو حکومت کا ملازم سمجھنا چاہیے۔ منصف ایک رویہ اور طرزِ عمل کا نام ہے جو مقننہ کے بعد سب سے بڑا درجہ رکھتا ہے۔ یہ ایک لحاظ سے قانون بناتا ہے بالفاظ دیگر مقننہ کے بنائے ہوئے قوانین کو معنی پہناتا اور اس میں رنگ بھرتا ہے۔ بدلتے حالات اور واقعات کے ساتھ قانون اور آئین کی تشریح کر کے اس کو حالات سے ہم آہنگ بناتا ہے، قوم، سول سروس اور باقی اداروں کی رہنمائی کرتا اور اس کو سمت عطا کرتا ہے۔ جج بحیثیت انسان جس طرزِ فکر کا آدمی ہوتا ہے، قانون کی تشریح بھی اسی فکر کے مطابق کرتا ہے اور یہ اس کا حق ہے۔ میں نے بھی اسی نظریہ کے تحت کام کیا۔ میں ریاست جموں وکشمیر کے پاکستان کے ساتھ الحاق اور آزاد کشمیر کو پاکستان کا عملی حصہ سمجھتا ہوں، اس لیے اس نوعیت کے سارے مقدمات کا فیصلہ بھی ان ہی خطوط پر کیا اور اس طرزِ فکر کی فیصلوں کے ذریعہ ترویج بھی کی۔